Sharjeel Ahmed

تعلیم و تربیت

اپریل

1997ء

ایک نیا سلسلہ

مجاہدینِ آزادی

قائدِ اعظمؒ کلاسک

دوسری قسط

روبن سن کروسو

ROBINSON CRUSOE

چھٹی قسط

Sharjeel Ahmed

تعلیم و تربیت مئی 1997ء

سالنامہ

- بچوں کے مشہور ادیبوں کی تحریریں
- رنگارنگ تصویریں
- صفحات پہلے سے زیادہ
- قیمت وہی 15 روپے

57 واں سال پہلا شمارہ

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

السلام علیکم و رحمتہ اللہ!

اِس مہینے بڑی عید 'عید الاضحیٰ' آرہی ہے۔ ہماری طرف سے پیشگی عید مُبارک۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شُکر ہے کہ تعلیم و تربیت کا اَطفالِ پاکستان نمبر ہماری توقع سے زیادہ پسند کیا گیا۔ بچّے تو بچّے' بڑوں کے بھی بے شمار تعریفی خط موصُول ہوئے۔ اِن میں سے چند ایک خط "آپ کا خط مِلا" میں شائع کئے گئے ہیں۔ تمام دوستوں کا شُکریہ کہ اُنہوں نے ہماری محنت کو سراہا۔

مارچ کے اداریے میں ہم نے لکھّا تھا کہ "یہ سال پاکستان کی گولڈن جُوبلی کا سال ہے"۔ ہم اِن شاء اللہ اِس پورے سال میں ہر مہینے اپنے پیارے وَطن کے بارے میں خصوصی تحریریں شائع کرتے رہیں گے۔ اَطفالِ پاکستان نمبر میں تحریکِ آزادی کے عظیم رَاہ نُما' چودھری رَحمت علیؒ کے بارے میں ایک مضمون' ایک دیوانہ' شائع ہوا تھا جسے قارئین نے نہ صرف بہت پسند کیا ہے بلکہ آیندہ بھی ایسے مضامین شائع کرنے کا پُر زور مطالبہ کیا ہے۔ لہٰذا اِس مہینے سے "مجاہدینِ آزادی" کا یہ سلسلہ باقاعدگی سے شُروع کیا جا رہا ہے۔

اور اب آپ کے لئے ایک اور خوش خبری' مئی میں تعلیم و تربیت کا سال نامہ شائع ہوگا۔ اِس رنگا رنگ سال نامے میں ہم نے اُن تمام ادیبوں کو جمع کر دیا ہے جن کی تحریریں آپ مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ اَطفالِ پاکستان نمبر کی طرح اِن شاء اللہ یہ بھی ایک یادگار شمارہ ہوگا اور ہاں!

صفحات زیادہ مگر قیمت پہلے جتنی ہی ہوگی۔

اس شمارے میں

اداریہ		1
حمدِ باری تعالیٰ (نظم)	امان اللہ نیّر شوکت	2
بھائی (کہانی)	بخت رسا	3
عید قرباں کیا مفید سبق سکھاتی ہے؟	ڈاکٹر عبدالرؤف	10
کھڑکی کا راز (کہانی)	محمد یونس حسرت	11
مگرمچھ کے آنسو	عبدالستار خان طاہر	15
(دل چسپ اور عجیب)		
کایا پلٹ (کہانی)	شکیل زاہد	21
آیئے مسکرائیں (لطائف)		26
بہار (نظم)	ضیغم حمیدی	27
عظیم باپ، عظیم بیٹا (نامور لوگ)	سید نظر زیدی	28
ہاتھ کی کمائی (کہانی)	نجمہ معراج	30
کھیلوں کی دنیا	سید شوکت اعجاز	34
داؤدی علمی آزمائش		36
آیئے دوست بنائیں (قلمی دوستی)		37
پائلٹ کا وعدہ (کہانی)	سلیم خان گمی	38
بلا عنوان (کارٹون)		45
آپ کا خط ملا		46
ایک روشن مینار (مجاہدینِ آزادی)	ڈاکٹر رضوان ثاقب	49
ہونہار مصوّر		52
پک بک (نظم)	جاوید امتیازی	53
آپ بھی لکھئے		54
رابن سن کروسو (چوتھی قسط)	قمر نقوی	60
قائدِ اعظم کلاسک (دوسری قسط)		66

چیف ایڈیٹر عبدالسلام

ایڈیٹر پبلشر ظہیر سلام

مشیر سعید لخت

سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر رضوان ثاقب

خصوصی مشیر محمود حسن روی

اسسٹنٹ ڈائریکٹر سید شوکت اعجاز

سرکولیشن اسسٹنٹ محمد بشیر ہاشمی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

پرنٹر عبدالسلام

سرکولیشن اور اکاؤنٹس 60۔ شاہراہِ قائدِ اعظم لاہور

سالانہ قیمت
پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) =/345 روپے
مشرقِ وسطیٰ، افریقہ (ہوائی ڈاک سے) =/690 روپے
یورپ ہوائی ڈاک سے =/770 روپے
امریکہ/شرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) =/890 روپے

قیمت فی پرچہ =/15 روپے

اپریل 1997ء

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ شارع بن بادیس لاہور فون: 6361309-6361310 6278815-6278816

سرورق: پائلٹ کا وعدہ

حمدِ باری تعالیٰ

خُدایا تیری قُدرت سے ہوئے دونوں جہاں پَیدا
ہوئے بس اِک اشارے سے زمین و آسماں پَیدا
پہاڑوں میں ہزاروں تُو نے چشمے کر دیئے جاری
بنے پھر ان سے دریا، ان میں کر دیں مچھلیاں پیدا
بسایا ننّھی ننّھی پیاری چڑیوں کو درختوں پر
ہوئیں پھر اِن سے کِیا کِیا میٹھی میٹھی بولیاں پَیدا
زمیں پر پیڑ جم کر تیری قُدرت سے پھَلے پھُولے
پھر اِن میں کیں پھَلوں سے سیکڑوں نیرنگیاں پَیدا
اِلٰہی تیرے ہی اَبرِ کرَم کی آب یاری سے
بہارِ باغِ عالم میں ہوئیں سب خُوبیاں پَیدا
تیری حمد و ثنا جاری ہے نیّر کی زُباں پر بھی
ہر اِک مسجد میں عظمت تیری کرتی ہے اَذاں پَیدا

امان اللہ نیر شوکت

بھائی

بخت رسا

"امّی، بھائی کب آئیں گے؟" ننّھے دانش نے ناشتے کی میز پر بیٹھ کر ٹانگیں ہلاتے ہوئے پُوچھا۔

"دوپہر کو" امّی نے دودھ کی پیالی اس کے آگے رکھتے ہوئے بتایا۔

"میں کب اسکول جاؤں گا؟" دانش نے بے تابی کا اظہار کیا۔

"اگلے سال، اِنْ شَاءَ اللہ" امّی ڈبل روٹی کے ٹکڑے پر جام لگاتے ہوئے بولیں۔

"اگلا سال کب ہوگا؟" دانش نے دودھ کی پیالی میں جھانکتے ہوئے پُوچھا۔

اگلا سال---- بارہ مہینوں کے بعد ہو گا" امّی کرُسی سے اُٹھتے ہوئے بولیں۔

بارہ مہینے کب ختم ہوں گے؟" دانی نے پُوچھنا چاہا مگر امّی باورچی خانے سے باہر جا چکی تھیں۔

دانش جسے سب پیار سے دانی کہتے تھے، ایک بہُت پیارا، گندمی رنگ کا گول مٹول بچّہ تھا۔ وہ اپنے امّی، ابّو، چچّا جان اور بڑے بھائی ابرار کے ساتھ رہتا تھا۔ دانی کی عُمر ابھی صرف چار سال تھی جب کہ اُس کا بڑا بھائی ابرار نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ننّھے دانی کو اپنے بھائی سے بے حد محبّت تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں، ابرار کو معصوم دانی سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ وہ ہر وقت دانی سے اکتایا رہتا اور بات بے بات اُسے ڈپٹ دیتا۔

ناشتا کر کے دانش مچھلیوں کے مرتبان کے قریب آ کھڑا ہوا اور اِدھر اُدھر تیرتی چمکیلی رنگین مچھلیوں کو غور سے دیکھنے لگا۔

"السّلامُ علیکم، دانی بیٹے کیا کر رہے ہو؟" چچّا جان بھی اس کے قریب آ گئے۔ دانی نے دیکھا وہ دفتر جانے کے لئے تیّار کھڑے تھے۔

"آپ دفتر جا رہے ہیں؟" دانش نے پُوچھا۔

"جی جان" چچّا نے اسے پیار کرتے ہوئے بتایا۔

"میں دفتر کب جاؤں گا؟" دانی نے پُوچھا۔

"جب آپ میرے جتنے ہو جائیں گے" چچا اپنا بریف کیس اُٹھاتے ہوئے بولے۔ پھر خُدا حافظ کہہ کر باہر چلے گئے۔ دانی نے بھی اُنہیں ہاتھ ہلا کر خُدا حافظ کہا اور امّی کے پاس آگیا۔ اس کی امّی کپڑے دھو رہی تھیں۔ دانی واشنگ مشین میں گرتے ہوئے پانی کو غور سے دیکھنے لگا' پھر اُس نے اپنا ہاتھ مشین میں گرتے ہوئے پانی میں ڈال دیا۔ "اوہو' دانش ساری آستین گیلی ہو گئی ہے؟" امّی نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ دانی بور ہو کر باہر آگیا۔

"آہا" سامنے صحن میں اس کی تین پہیوں والی سائیکل کھڑی تھی۔ "سائیکل چلاتا ہوں" وہ سائیکل پر بیٹھتے ہوئے خود سے بولا۔ وہ کافی دیر یونہی صحن کے چکر لگاتا رہا۔ پھر اچانک اس نے سائیکل پڑوسیوں کی دیوار کے قریب روک لی' اور سیمنٹ اور اینٹوں کی جالی دار دیوار سے دوسری طرف جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اپنی اس کوشش میں اسے کچھ خاص کامیابی نہ ہوئی۔ وہ مایوس ہو کر پیچھے ہٹا تو اس کی نظر سیمنٹ کے ان ٹکڑوں پر پڑی جو دیوار سے الگ ہو کر جالی میں اٹک گئے تھے۔ دانی نے اپنی انگلی کی مدد سے انہیں باہر نکال لیا اور منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔ "اوں ہوں' یہ تو——" اسے دانتوں کے نیچے سیمنٹ کی ریتلی کچکچاہٹ اچھی نہ لگی۔ وہ صحن میں لگے نل کی طرف بھاگا' جب کلی کر کے پیچھے ہٹا تو اس کی نظر اپنے جوتوں پر پڑی۔

"او' یہ تو گیلے ہو گئے ہیں" اس نے جوتے اتار کر دھوپ میں رکھ دیئے۔ پھر وہ اوندھے منہ بیرونی گیٹ کے قریب فرش پر ہی لیٹ گیا اور گیٹ کے نیچے سے سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں اور راہ گیروں کو دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں گاڑیوں کے پہیوں اور راہ گیروں کے پیروں کا دور تک تعاقب کرتی رہیں اور انہیں دیکھ کر نجانے وہ کیا کچھ سوچتا رہا۔

"دانی بیٹے کہاں ہو؟" امی کی آواز پر دانی یک دم اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ گیا اور بھاگ کر جوتے پہن لیے۔

"جی امی جان" وہ امی کے پاس باورچی خانے میں چلا آیا۔

"بیٹے کیا کر رہے ہو؟ جاؤ اپنا قاعدہ لے آؤ' میں تمہیں سبق پڑھا دوں"۔

دانش نے سبق پڑھ لیا تو امی نے اسے کھانے کو ایک کیلا دیا۔ وہ کیلا لے کر باہر آگیا اور سائیکل پر بیٹھ کر مزے سے کھانے لگا۔ پھر اس نے کیلے کے چھلکے کو چار حصوں میں تقسیم کر کے سائیکل کے ہینڈل میں اڑس لیا۔ اس کے بعد اس نے پھر سے جوتے اتار کر دھوپ میں رکھ دیئے اور ننگے پاؤں سائیکل چلانے لگا۔ وہ مزے سے سائیکل چلاتا رہا' اور اس کی نئی سجاوٹ کو دل ہی دل میں سراہتا رہا۔ "بھائی آئیں گے' تو انہیں دکھاؤں گا" اس نے سوچا۔ پھر اسے بیرونی گیٹ میں سے ابرار بھائی اندر آتے دکھائی دیئے۔ "آہا' بھائی آ گئے" دانی دوڑ کر ان سے لپٹ گیا۔

"اوہو' چھوڑو بھئی' یہ کیا بدتمیزی ہے؟ اسکول سے آتے ہی سر پر سوار ہو جاتے ہو' اور یہ ننگے پاؤں سائیکل کیوں چلا رہے ہو' اور سائیکل پر یہ کیا کچرا لگایا ہے۔ اتار دو اسے" ابرار نے دانی کے بازو کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

ابرار اندر چلا گیا تو دانی نے فوراً" جوتے پہن لیے۔ "جوتے اتارنے پر تو امی بھی خفا ہوں گی" دانی نے سوچا۔ اسی وقت اسے امی نے کھانا کھانے کے لئے اندر بلا لیا۔ کھانے کی میز پر امی اور بھائی کے ساتھ چچا بھی موجود تھے۔

"ابو کب آئیں گے؟" انہیں دیکھ کر دانی نے پوچھا۔

وہ تو رات ہی کو آتے ہیں" چچا جان نے مسکرا کر جواب دیا۔ کھانے کے دوران میں اچانک دانی بولا "بھائی اسکول اچھا ہوتا ہے؟"

"جی ہاں' یقیناً بہت اچھا ہوتا ہے' وہاں تم جیسے بے وقوف بچے نہیں ہوتے" ابرار نے جلے سے انداز میں جواب دیا۔

"اوہو' ابرار یہ کیا طریقہ ہے' چھوٹے بھائی سے

بات کرنے کا" چچّا نے ابرار کی سرزنش کی۔
اگلے روز امّی نے دانی کو ناشتے میں انڈا ابال کر دیا۔ دودھ پینے کے بعد دانی کچھ دیر تو میز پر سر ٹکائے انڈے کو دیکھتا رہا پھر ہاتھ میں لے کر کھیلنے لگا۔ "دانی انڈے سے صرف کھیلنا ہی ہے؟ کھانا نہیں کیا؟" امی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"امی بعد میں کھاؤں گا، ابھی کوٹ کی جیب میں رکھ لوں؟" دانی نے پوچھا۔

"چلو رکھ لو، مگر کھا ضرور لینا" امی نے ہنس کر کہا۔

دانی سائیکل لے کر صحن میں آگیا۔ سائیکل چلاتے چلاتے وہ بار بار کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر انڈے کو چھوتا۔ اسے گرم گرم گول گول انڈا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

دوپہر کو جب ابرار اور چچّا گھر آئے تو دانش امی کو سبق سنا رہا تھا۔ دانی کھانے کے بعد ابرار بھائی کے کمرے کی طرف آیا۔ وہ کمرے میں موجود نہ تھے۔ غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید بھائی جان ٹیوشن سنٹر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اچانک دانی کی نظر بستر کے نیچے رنگ برنگی پتنگوں پر پڑی۔ "آہا!" دانش فوراً نیچے بیٹھ کر پتنگیں دیکھنے لگا۔ "کتنی پیاری ہیں۔ میں بھی اڑاؤں گا" دانی نے ایک ست رنگی پتنگ باہر نکالتے ہوئے سوچا۔

"اوئے، یہ کیا کر رہے ہو؟" ابرار اسے پکڑتے ہوئے دھاڑا۔

"صرف دیکھ رہا ہوں" دانی معصومیت سے بولا۔

"میری اجازت کے بغیر تم نے کیوں ہاتھ لگایا، بدتمیز" "چٹاخ" بھائی نے دانی کے پھول سے گال پر تھپّڑ رسید کر دیا۔ درد سے دانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ آواز سن کر چچا بھی کمرے میں آ گئے۔

"ابرار یہ کیا حرکت ہے، کیوں مارا ہے تم نے ننھے کو؟" چچا نے دانی کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے غصے سے پوچھا۔

"اس نے میری اجازت کے بغیر میری پتنگیں چھیڑی ہیں۔ اگر پھٹ جاتیں تو" ابرار خفگی سے بولا۔

"تم شاید خود بھی نہیں جانتے کہ تم خود کتنے بدتمیز اور کم عقل ہو" چچا نے ابرار کو ڈانٹ دیا تو وہ سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔ چچّا نے دانی کو جو ابھی تک رو رہا تھا، گود میں اُٹھا کر پیار کیا اور اُسے لے کر امّی کے پاس چلے آئے۔

"ننھے تم کیوں گئے تھے' بھائی کے کمرے میں؟" امی نے ساری بات سننے کے بعد پوچھا۔

"امی' میں تو بھائی کو یہ انڈا دینے گیا تھا" دانش نے جیب سے انڈا نکال کر دکھاتے ہوئے کہا تو امی حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔ اگلے تین چار روز ابرار کا موڈ خاصا خوش گوار تھا۔ اب نہ تو وہ دانی کو بات بے بات ڈانٹ رہے تھے اور نہ ہی کسی سے دانی کی بے عقلی کا شکوہ کر رہے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اگلے جمعے بسنت تھی اور امی نے اس مرتبہ ابرار کو اس موقع پر اپنے دوستوں کو گھر بلانے کی اجازت دے دی تھی۔ جمعرات کو ابو جان بھی جلدی گھر آ گئے۔ دانی کھانے کے بعد ابو کے ساتھ ہی لیٹ گیا۔

شام کو ابرار کے ساتھ ان کے دو دوست بھی گھر آئے' وہ تینوں آتے ہی چھت پر چلے گئے۔ دانی بھی ان کے پیچھے چھت پر آ گیا۔ "السلام علیکم بھائی جان" دانی نے بھائی کے دوستوں کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام' ارے پیارا دانی آیا ہے" عاطف نے دانی سے مصافحہ کیا۔

"آپ کیا کر رہے ہیں؟" دانی ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

"جناب ہم بسنت منانے کی تیاری کر رہے ہیں" عامر بھائی بھی ان کے قریب آ گئے۔ "دانی تم بھی ہمارے ساتھ بسنت مناؤ گے نا" وہ بولے۔

"جی" دانی کو انجانی سی خوشی ہوئی۔

"اوہو یار' ابھی اتنا کچھ کرنا ہے' کیا کر رہے ہو تم لوگ' اور دانی صاحب زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں' بس خاموشی سے کھڑے رہو" ابرار بھائی حسب عادت چڑ کر بولے۔

دانش کچھ دیر کھڑا انہیں دیکھتا رہا' پھر اسے ابو نے آواز دی "دانش آؤ بازار چلیں"۔ تو دانی بھاگ کر نیچے آ گیا۔

بازار میں بہت بھیڑ تھی۔ ہر طرف لوگ چھوٹی بڑی' رنگ برنگی پتنگیں خرید رہے تھے۔ دانی کو رنگوں کی یہ بہار بہت اچھی لگی۔ اس کا دل چاہا سب پتنگیں خرید لے۔ اس کے ابو اسے ایک دکان میں لے گئے۔ دکان دار نے انہیں پلاسٹک کی بنی ہوئی 5'6 پتنگیں دکھائیں۔ "یہ رات کو چمکتی ہے" دکان دار نے ایک سفید رنگ کی پتنگ دکھاتے ہوئے کہا۔

"ابو ایک یہ اور ایک یہ" دانی نے سفید چمکنے والی پتنگ کے ساتھ ایک گلابی پتنگ پکڑ کر کہا۔

گھر آ کر دانی سیدھا چھت پر گیا۔ "بھائی یہ لیں" اس نے ابرار بھائی کو چمکنے والی پتنگ دی۔ "یہ رات کو چمکتی ہے" دانی نے بتایا۔

"میرے لیے لائے ہو؟" ابرار نے حیرت سے پوچھا۔

"جی' اڑائیں نا اب۔ اندھیرا تو ہو گیا ہے۔ یہ چمکے گی" دانی جوش سے بولا۔

"شکریہ دانی" ابرار قدرے دھیمے لہجے میں بولا۔

"لاؤ یار' بسنت دانی کے تحفے سے ہی شروع کرتے ہیں" عاطف نے مُسکرا کر کہا۔

دانش اُن کے پاس ہی ایک پرانے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اُسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہر طرف روشنیاں ہی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ دور دور تک چھتوں پر لوگ چڑھے ہوئے تھے۔ پھر ابرار کے تین اور دوست آ گئے۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑا سا کیسٹ پلیئر بھی لے کر آئے' اور پھر بہت سے پڑوسیوں کی دیکھا دیکھی ان کی چھت پر بھی موسیقی بجنے لگی۔ آہستہ آہستہ آسمان پر پتنگوں کی تعداد بڑھنے لگی' مگر دانی کی نظریں تو صرف ابرار بھائی کی چمکنے والی پتنگ کا تعاقب کر رہی تھیں۔ امی کے بلانے پر وہ نیچے چلا تو آیا مگر بستر میں لیٹ کر بہت دیر تک موسیقی' بو کاٹا اور خالی پیپے بجانے کی آوازیں سنتا رہا۔ پھر اسے نیند نے آ لیا۔

اگلے دن جب اس کی آنکھ کھلی تو فضا میں عجیب سکوت تھا۔ ناشتے کی میز پر اس نے امّی سے پوچھا "امی بسنت کب شروع ہوگی؟"

"بیٹا ساری رات تو مناتے رہے ہیں بسنت۔ آنکھ کھل جائے گی تو پھر شروع ہو جائیں گے" امی نے اکتاہٹ سے کہا۔

امی نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہی رات کا سماں بندھ گیا۔ دانی بھی بھائی اور اس کے دوستوں کے ساتھ چھت پر آ گیا۔ وہ اپنی گلابی پتنگ بھی ساتھ لے آیا۔ بھائی کے دوست قاسم نے اسے بھی ڈور ڈال دی۔ وہ اپنی پتنگ لے کر ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ "دانش ڈور پر پیر مت رکھو' یہ خراب ہو جائے گی" ابرار نے اسے ٹوکا۔

شام تک یہی شور شرابا جاری رہا۔ سب لڑکوں نے دوپہر کا کھانا بھی چھت پر ہی کھایا۔ اندھیرا ہونے پر پھر بڑے بڑے بلب روشن ہو گئے۔ موسیقی اور نعروں کی آوازیں مزید بلند ہو گئیں۔ اتنے شور سے دانی کچھ پریشان ہو گیا۔ اچانک اس کی نظر ابرار بھائی کی ست رنگی پتنگ پر پڑی۔ پتنگ کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ ست رنگی پتنگ کے قریب ہی اسے آسمان پر ایک بڑا سیاہ گڈا نظر آیا۔ دونوں کی ڈوریں آپس میں الجھی ہوئی تھیں اور کسی بھی لمحے ابرار بھائی کی پتنگ کٹ سکتی تھی۔ باقی دوست بھی اپنا کھیل چھوڑ کر انھی کی پتنگ پر نظر جمائے کھڑے تھے۔ "او' تو کیا بھائی کی اتنی پیاری

پتنگ کٹ جائے گی اور کٹ گئی تو پھٹ جائے گی" یہ سوچ کر دانی پریشان ہو گیا۔

اسی لمحے پتنگ کٹ گئی اور کشتی کے بادبان کی طرح نیچے گرنے لگی۔ فضا میں بوکاٹا کا شور مچ گیا۔ دانی گرتی پتنگ پر نظریں جمائے منڈھیر کی طرف لپکا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کٹی ہوئی ڈور پکڑنا چاہی مگر ایسا کرنے میں وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نیچے گر گیا۔

"ابرار! ابرار' دانی نیچے گر گیا ہے" قاسم چیخا اور نیچے بھاگ گیا۔ ابرار کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے منڈھیر سے جھانکا۔ دانی چھت سے کوئی پانچ چھ فٹ نیچے چھجے پر بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون بہ رہا تھا۔ دانی کی یہ حالت دیکھ کر تو ابرار اور بھی حواس باختہ ہو گیا۔ وہ عامر اور عاطف کی مدد سے ہمت کر کے چھجے پر اترا۔ اتنی دیر میں قاسم امی' ابو اور چچا کو لے کر نیچے پہنچ چکا تھا۔ ابرار نے بہت احتیاط سے دانی کو گود میں اٹھایا اور سب کی مدد سے جیسے تیسے اسے نیچے اتارا۔ امی' ابو اور چچا دانش کو لے کر فوراً" ہسپتال چلے گئے۔ ادھر گھر میں ابرار کا پریشانی سے برا حال ہو رہا تھا۔ دوستوں کے چلے جانے کے بعد تو وہ بالکل اکیلا رہ گیا۔ "نجانے دانش کیسا ہوگا؟ پتا نہیں اس کو چوٹ کہاں آئی ہے؟" وہ بار بار بے کل ہو کر سوچتا۔ اس کی نظروں کے سامنے دانش کا معصوم گول مٹول چہرہ گھوم رہا تھا۔ اسے اب اپنی کی ہوئی زیادتیوں کا احساس شدت سے ہو رہا تھا "کتنا پیارا اور معصوم بھائی ہے میرا' اور میں خواہ مخواہ اس سے چڑ جاتا ہوں۔ کتنی محبت سے اس نے مجھے چمکنے والی پتنگ دی تھی" یہ سوچ کر ابرار کے گلے میں کچھ اٹکنے لگا۔ وہ بہت دیر ادھر ادھر گھومتا رہا پھر چچا گھر واپس آ گئے۔ ابرار کے دریافت کرنے پر انہوں نے بڑی رکھائی سے بتایا کہ دانی کے سر اور ٹانگ پر چوٹیں آئی ہیں اور اسے ابھی ابھی ہوش آیا ہے' مزید یہ کہ امی اورابو اس کے پاس ہی رہیں گے۔ اس رات ابرار بہت دیر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح اس کی آنکھ اسکول لگنے سے صرف آدھا گھنٹا پہلے کھلی' اور وہ جلدی سے الٹا سیدھا تیار ہو کر اسکول چلا گیا۔ اسکول میں بھی اس کی طبیعت بے زار اور افسردہ رہی۔ "یار' اسکول کے بعد دانی کو دیکھنے چلیں گے" اسے فکر مند دیکھ کر عامر نے کہا۔

"کیسے جا سکتے ہیں' بھول گئے آج کل ٹیوشن سنٹر میں ٹسٹ ہو رہے ہیں۔ ناغہ کرنے والے یا دیر سے آنے والے کو سر بھاری جرمانہ کرتے ہیں اور بے عزتی الگ" عاطف نے یاد دلایا تو ابرار نے بھی ہسپتال جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ٹیوشن سنٹر سے واپسی پر سب دوست اگلے روز کے ٹسٹ کی تیاری کرتے رہے۔ تین دن اسی طرح گزر گئے' ابرار شدید کوفت کا شکار تھا۔ اس نے کئی مرتبہ ہسپتال فون کرنے کی کوشش کی مگر لائن کبھی بھی خالی نہ ملتی۔ آج آخر کار خدا خدا کر کے لائن مل گئی۔ اس نے بے تابی سے امی کو بلوایا۔ "امی' دانی کیسا ہے؟" ابرار نے امی کو سلام کرنے کے بعد بے تابی سے پوچھا۔

"بیٹا دانی اب بہت بہتر ہے' تم خود تو ٹھیک ہو نا' بیٹے کھانا وقت پر کھا لیا کرو' اور چچا کو شکایت کا موقع نہ ملے" امی نے فکر مندی سے کہا۔

"جی امی' آپ گھر کب آئیں گے" ابرار نے بے چینی ظاہر کی۔

"بیٹا' دانی اب بہت بہتر ہے۔ ان شاء اللہ ہم دو دن میں گھر واپس آ جائیں گے" امی نے بتایا۔

"امی' دانی کو میرا بہت پیار دیں" اتنا کہہ کر اس کی آواز بھرا گئی اور اس نے فون بند کر دیا۔ بھائی کے بغیر وقت گزارنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ دانش آ کر ان سے لپٹ جائے' بے شک اس کی ساری پتنگیں پھاڑ دے' بھلے اس کے سامنے ننگے پیر سائیکل چلائے' مگر جلد از جلد صحت یاب ہو کر گھر لوٹ آئے۔ وہ دانی کے چھوٹے سے بستر پر بیٹھ کر اپنی گیلی آنکھیں رگڑنے لگا۔

Sharjeel Ahmed

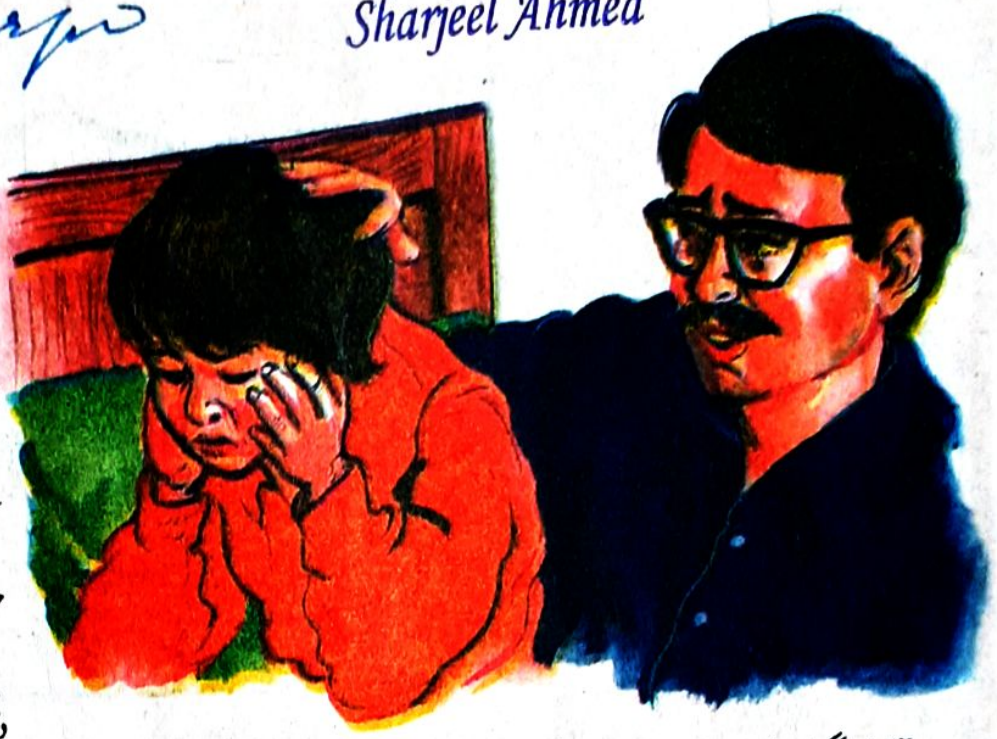

"ابرار' کیا ہوا ہے؟" چچا نے ابرار کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"جی کچھ نہیں" وہ سنبھل کر بولا۔

دانی یاد آ رہا ہے نا" وہ ان کے قریب بیٹھ گئے۔ "دیکھو ابرار' میرا خیال ہے دانی کی غیر حاضری میں تمہیں احساس ہو چکا ہے کہ تمہیں وہ کتنا عزیز ہے۔ دانی تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ تم اس کے بڑے بھائی ہو۔ اگر وہ کوئی نادانی کرے تو ناراض ہونے کی بجائے اسے پیار سے سمجھاؤ' وہ تمہاری بات فوراً" مان لے گا" چچا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شفقت سے سمجھایا۔

"جی چچا جان' مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہے" ابرار نے سر جھکا کر دبے لہجے میں بتایا۔

اگلے روز ابرار کا دل چاہا کہ اسکول سے گھر نہ ہی جائے۔ "کیا کروں گا خالی گھر میں' میرا پیارا دانی تو ہے نہیں' اور نہ ہی امی ہوں گی" اس نے سوچا' مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا' ٹیوشن سنٹر جانے کے لئے تیاری بھی تو کرنا تھی۔ وہ بھاری قدموں سے گھر میں داخل ہوا اور جیب سے اندرونی دروازے کی چابی نکالی۔ مگر یہ کیا؟ دروازہ تو پہلے ہی کھلا تھا۔ اندر سے دانی کی مخصوص ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔

"دانی" ابرار بستا وہیں پھینک کر اندر بھاگا۔ دانی اپنے بستر پر لیٹا چچا جان کی کسی بات پر ہنس رہا تھا۔ امی بھی پاس بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔

"دانی تم آ گئے؟" ابرار نے بھاگ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ دانی بستر سے کچھ مشکل سے اٹھا۔ "بھائی جان" وہ بہت محبت سے ابرار سے لپٹ گیا۔ ابرار نے دیکھا کہ دانی کا چمکتا ہوا گندمی رنگ کچھ سانولا ہو گیا ہے' مگر وہ پھر بھی مسکرا رہا تھا۔ "دانی تم مجھے بہت یاد آتے تھے۔ میں تمہارے بغیر بہت اداس تھا"۔ ابرار نے اپنے دل کا حال کہ ڈالا تو امی مسکرا دیں۔ پھر وہ باورچی خانے میں سے اپنے کھانے کی ٹرے لے کر دانش کے پاس ہی آ گیا۔ وہ جتنی دیر کھانا کھاتا رہا۔ دانی انہیں مسکرا کر دیکھتا رہا۔ ابرار کو دانی بہت پیارا لگ رہا تھا۔ اس نے اسے گود میں بٹھا لیا اور دونوں باتیں کرنے لگے۔ اچانک ابرار کو کچھ خیال آیا تو اس نے دانی سے پوچھا "دانی تم گر کیسے گئے تھے؟"

"میں آپ کی پتنگ پکڑ رہا تھا" وہ معصومیت سے بولا۔

"وہ کیوں' وہ تو کٹ ہی گئی تھی" ابرار بھائی کو حیرت ہوئی۔

"کٹ تو گئی تھی' اگر نیچے گر جاتی تو پھٹ جاتی نا' اتنی پیاری' اتنی قیمتی تو تھی" دانی نے گول گول آنکھیں کھول کر بتایا۔

ابرار اسے حیرت اور محبت سے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے دانی کو گلے سے لگا لیا۔ "دانی تم کتنے پیارے بچے ہو"۔ دانی ایک بار پھر بھائی سے لپٹ گیا اور چچا جان دونوں بھائیوں کو دیکھ کر مسکرا دیئے۔

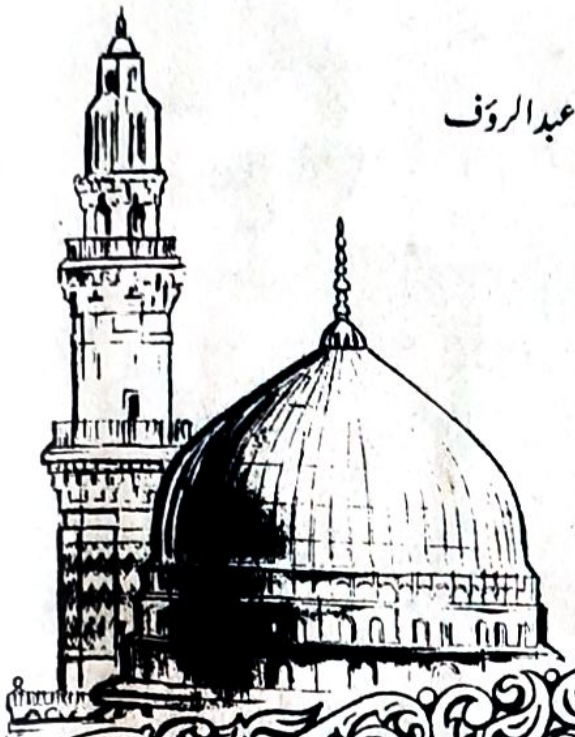

ڈاکٹر عبدالرؤف

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں

عید قربان کیا مفید سبق سکھاتی ہے؟

پیارے نبیؐ کی پیاری باتوں کی اس مختصر مجلس میں آج ہمارا موضوع ہے: "عید قربان کیا مفید سبق سکھاتی ہے؟"

ہمارے پیارے نبیؐ نے فرمایا

"عیدالاضحیٰ کے دن قربانی سے زیادہ کوئی عمل اللہ تعالےٰ کو محبوب نہیں"۔

اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پیاری باتوں میں عید قربان کے تمام فرضوں اور اس کی تمام دانائیوں کی خوب وضاحت فرمائی ہے۔ ان سب باتوں کا نچوڑ یہ ہے کہ یہ عید ہمیں ایثار اور قربانی کے سنہرے سبق سکھاتی ہے۔ کسی جانور کو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ذبح کرنا' اس کا گوشت خود کھانے کے علاوہ غریبوں اور مسکینوں میں بانٹنا ایک بہت ہی بامعنی عمل ہے۔

جانور کی قربانی کا مرکزی مقصد مسلمانوں کو ڈرامائی انداز میں یہ بات سمجھانا ہے کہ زندگی کو سب کے لئے خوب صورت اور خوش گوار بنانے کے لیے قربانی اور ایثار بے حد ضروری ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ دوسروں کے لیے قربانی اور ایثار صرف عیدالاضحیٰ کے روز ہی فرض نہیں ہوتے۔ بلکہ اس نیک جذبے کا عملی اظہار ہر روز اور ہر جگہ ہونا ضروری ہے۔

بچّوں کی زندگی سنوارنے کے لیے عیدالاضحیٰ سے یہی سبق نکلتا ہے کہ آپ اپنے گھر میں اپنے بہن بھائیوں اور نوکروں کی بہتری اور خیرسگالی کے جذبے کو فروغ دیں۔ اپنے محلّے اور گاؤں میں غریبوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں شرکت کریں اور اپنے اسکول میں غریب ساتھیوں سے دوستی بڑھائیں اور ان کی ہر ممکن مدد کریں۔ جہاں کہیں بھی کسی خود غرض انسان' خود غرض خیال یا خود غرض عمل کی کوئی بھی صورت نظر آئے آپ اپنی بساط کے مطابق اس کی مخالفت بھی کریں اور اصلاح بھی۔

کھڑکی کا راز

محمد یونس حسرت

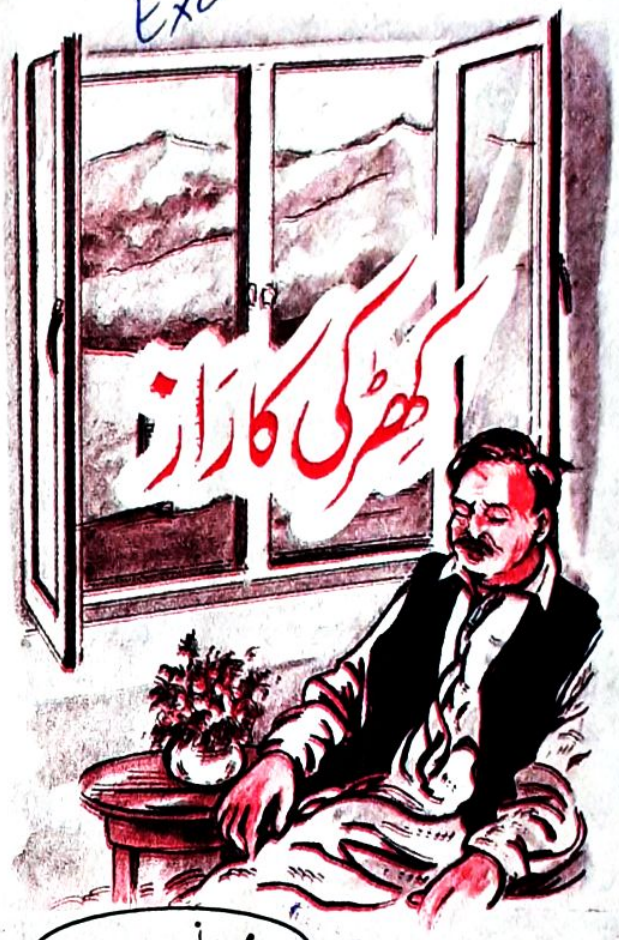

"آپ تشریف رکھیے حامد صاحب' خالہ جان ابھی آجاتی ہیں"۔

یہ الفاظ ایک 14،13 سال کی لڑکی نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہے تھے۔ حامد تھکے تھکے انداز سے کرسی میں دھنس گیا اور سوچنے لگا کہ اس صحت افزا پہاڑی مقام پر اس کی گرتی ہوئی صحت کس حد تک اور کتنی جلدی بحال ہو سکتی ہے۔ وہ ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق یہاں آیا تھا۔ اس کی بڑی بہن چار پانچ سال تک اس شہر کے ایک اسکول میں ملازمت کرتی رہی تھی اور اس نے اس شہر کے چند لوگوں کے نام تعارفی خطوط دیتے ہوئے اسے کہا تھا۔

"میں نے اپنی ملازمت کے دوران میں اس شہر کے لوگوں کو بڑا ملنسار پایا ہے۔ تم ان سے ملو گے تو وہ ضرور کسی نہ کسی حد تک تمہارے کام آئیں گے---- اور تمہیں وہاں رہتے ہوئے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی"۔

نوجوان حامد کرسی میں دھنسا ہوا سوچ رہا تھا کہ اس گھر کی خاتون طاہرہ خانم' جن کے نام تعارفی خط لے کر وہ اس مکان پر آیا تھا' اس کے لئے مددگار ثابت ہوتی ہیں یا نہیں۔ اس کی ہمشیرہ نے تو طاہرہ خانم کی بڑی تعریفیں کی تھیں اور کہا تھا کہ ان سے ملنے کے بعد شاید تمہیں کسی اور کے پاس جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

حامد ان سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ لڑکی کہنے لگی "مسٹر حامد' آپ یہاں جانتے ہیں کسی کو؟"

"کسی کو بھی نہیں" حامد نے جواب دیا "میں تو پہلی بار اس قصبے میں قدم رکھ رہا ہوں' ہاں میری بڑی ہمشیرہ 4'5 سال پہلے یہاں ایک اسکول میں ملازمت کرتی رہی ہیں اور انہوں نے ہی مجھے اس قصبے کے چند لوگوں کے نام تعارفی خط دیئے ہیں"۔

یہ سن کر اس لڑکی نے کہا "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ خالہ جان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے"۔

"بس ان کا نام اور پتا جانتا ہوں" حامد نے کہا اور کہتے ہوئے اردگرد دیکھ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ اس لڑکی کی خالہ طاہرہ خانم شادی شدہ ہو گی یا بیوہ۔ لیکن کمرے کے ساز و سامان سے صرف یہ پتا چلتا تھا کہ اس گھر میں کوئی مرد بھی رہتا ہے۔

"کوئی تین سال ہوئے ان کے ساتھ یہ درد ناک حادثہ پیش آیا تھا" لڑکی نے کہا "غالباً" اس وقت آپ کی ہمشیرہ یہاں نہیں تھیں ورنہ انہوں نے آپ کو اس بارے میں ضرور بتا دیا ہوتا"۔

"درد ناک حادثہ" حامد نے اپنے خیالات سے چونک کر کہا "کیا ایسی پرسکون اور صحت افزا جگہوں پر بھی حادثے ہوتے ہیں؟"

"حادثے کہاں نہیں ہوتے" لڑکی نے ایک ٹھنڈی سی آہ بھر کر کہا۔ پھر وہ ایک بڑی سی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی "آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ ہم اس موسم میں شام کے وقت بھی یہ کھڑکی کھلی کیوں

رکھتے ہیں"۔

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟" حامد نے کہا "میرے خیال میں ابھی اتنی سردی شروع نہیں ہوئی کہ ساری کھڑکیاں بند رکھی جائیں--- کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کھڑکی کا حادثے سے کوئی تعلق ہے"۔

"جی ہاں" لڑکی نے جواب دیا "ہے اور بالکل اسی کھڑکی سے ہے۔ آج سے پورے تین سال پہلے کی بات ہے۔ خالو جان اور ان کے دو چھوٹے بھائی شکار کھیلنے گئے تھے اور آج تک واپس نہیں آئے۔ شاید دلدلی علاقے سے گزرتے ہوئے وہ کہیں غرق ہو گئے ہوں گے۔ بارش ہو جائے تو اس کے بعد محفوظ سے محفوظ دلدلی راستے بھی اچانک خطرناک ہو جاتے ہیں۔ بڑی تلاش کے باوجود ان کی لاشیں نہیں مل سکیں" یہ کہتے ہوئے لڑکی کی آواز بھرا گئی۔

"خالہ جان بے چاری اب تک یہی سمجھتی ہیں کہ وہ کسی روز واپس آ جائیں گے---- نہ صرف وہ تینوں کے تینوں واپس آ جائیں گے بلکہ ان کا کتا موتی بھی ان کے ساتھ ہوگا جو ان کے ساتھ ہی گم ہوا تھا۔ خالہ جان کو بالکل یقین ہے کہ جیسے وہ اس کھڑکی سے کود کر باہر گئے تھے، ویسے ہی کسی روز اس کھڑکی سے کود کر اندر آ جائیں گے جیسے کہ ان کا معمول تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کھڑکی گرمی ہو یا سردی، ہر موسم میں کھلی رہتی ہے۔ خالہ جان اکثر مجھے بتایا کرتی ہیں کہ وہ کیسے باہر گئے تھے۔ خالو جان کے کندھے پر گہرے سبز رنگ کی برساتی تھی اور ان کا چھوٹا بھائی اپنا پسندیدہ گیت گاتے ہوئے آگے آگے جا رہا تھا۔ اس کی آواز تو کوئی ایسی سریلی نہیں تھی مگر سریلی آواز نہ ہونے کے باوجود اسے گانے کا شوق تھا---- تین سال ہو گئے ہیں اس حادثے کو اور سچی بات تو یہ ہے کہ خالہ جان ہی نہیں، میں بھی بعض دفعہ یوں محسوس کرتی ہوں جیسے وہ سچ مچ واپس آنے والے ہیں--- ابھی آئے کہ آئے"۔

یہ کہہ کر لڑکی خاموش ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی لڑکی کی خالہ، طاہرہ خانم کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے آتے ہی کہا "معاف کرنا مجھے ذرا دیر ہو گئی ہے۔ تمہاری ہمشیرہ یہاں ہوتی تھیں تو ان سے میری اکثر ملاقات رہتی تھی۔ کیا حال ہے ان کا؟"

"ٹھیک ہیں" حامد نے جواب دیا "البتہ میں خود ٹھیک نہیں ہوں۔ مجھے ڈاکٹروں نے کچھ عرصہ کسی صحت افزا مقام پر گزارنے کا مشورہ دیا ہے اور اسی حوالے سے میری ہمشیرہ نے آپ کے نام تعارفی خط دیا تھا"۔

طاہرہ خانم نے حامد کی بات سن تو لی مگر اس کے بارے میں کوئی بات کرنے کی بجائے انہوں نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ اگر ہم یہ کھڑکی کھلی رکھیں تو تم برا محسوس نہیں کرو گے۔ میرے شوہر اور ان کے بھائی شکار سے واپس آنے والے ہیں۔ امید ہے کہ ہم آج کے شکار سے تمہاری تواضع کر سکیں گے۔ وہ ہمیشہ اسی کھڑکی سے کود کر آتے جاتے ہیں۔ آج

صبح وہ دلدل کی طرف شکار کھیلنے گئے تھے۔ انہیں شکار کا بڑا شوق ہے۔ اکثر مردوں کو یہ شوق ہوتا ہے"۔

طاہرہ خانم ہنس ہنس کر اپنے شوہر کے شکار کے شوق کے بارے میں باتیں کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آج کل تو شکار بہت کم ہو گیا ہے اور سردیوں میں تو مرغابیاں ویسے بھی مشکل سے ملتی ہیں۔ حامد ان کی یہ باتیں سن رہا تھا اور اندر ہی اندر ایک دکھ سا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ طاہرہ خانم کی باتوں کا رخ کسی اور طرف موڑ دے لیکن اسے کام یابی نہیں ہو رہی تھی۔ اسے رہ رہ کر یہ احساس ہو رہا تھا کہ طاہرہ خانم اس کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہے۔ اس کی بجائے اس کی ساری توجہ کھڑکی کی طرف ہے اور ان کی نظریں برابر کھڑکی کے پار بڑے دروازے کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ اس درد ناک حادثے کی عین تیسری برسی کے دن یہاں آیا تھا۔ حامد نے سوچا کہ شاید میں اس جگہ اپنی آمد کے حوالے سے بات

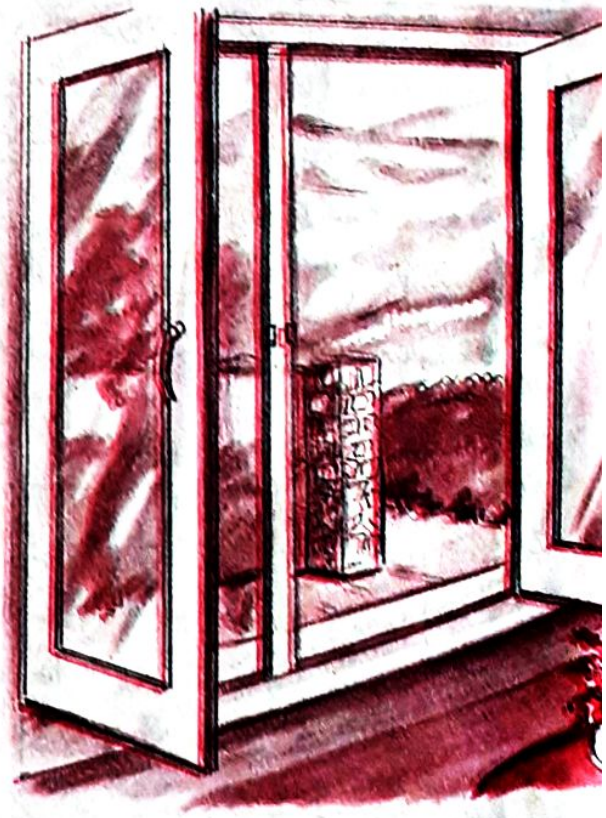

کروں تو اس طرح موضوع بدل جائے۔ وہ کہنے لگا۔

"ڈاکٹروں نے مجھے مکمل طور پر آرام کرنے اور کسی صحت افزا مقام پر سکون اور اطمینان سے کچھ عرصہ گزارنے کا مشورہ دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مجھے سخت قسم کی جسمانی مشقت بالکل نہیں کرنی چاہیے اور ہر قسم کی پریشانی سے بچنا چاہیے۔ انہوں نے غذا کے بارے میں بھی سخت احتیاط سے کام لینے کی تاکید کی ہے"۔

حامد کا خیال تھا کہ اپنی صحت کے بارے میں ان باتوں کے جواب میں طاہرہ خانم اور کچھ نہیں تو ہمدردی کے دو بول ضرور کہے گی' مگر نہ جانے کیوں اس نے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ حامد کی باتوں کو سن تو یقیناً رہی تھی مگر اس کا دھیان شاید حامد کی باتوں کی بجائے کسی اور ہی طرف تھا اور اس کی نظریں تھیں کہ برابر کھڑکی کے پار دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ پھر وہ جیسے بے خیالی کے عالم میں چلا اٹھی۔

"لو' وہ آ ہی گئے آخر---- اور آئے بھی ہیں تو عین چائے کے وقت پر---- تم ان سے مل کر یقیناً بہت خوش ہو گے--- ویسے دیکھو تو سہی' دلدل میں سے گزرنے کی وجہ سے وہ کیسے سر سے پاؤں تک کیچڑ میں لت پت ہو رہے ہیں"۔

حامد حیران رہ گیا۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھا تو اس کی حیرانی اور بڑھ گئی۔ کیوں کہ لڑکی ایسی نظروں سے کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی جن سے خوف جھلکتا تھا۔ حامد انجانے خوف سے کانپ اٹھا اور پھر اس کی نگاہیں بھی جیسے خود بخود کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔

شام کی دھندلی روشنی میں تین آدمی کھڑکی کی طرف آتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی بندوقیں ان کے کندھوں پر لٹک رہی تھیں۔ ان میں سے ایک کے کندھے پر گہرے سبز رنگ کی برساتی جھول رہی تھی اور ایک کتا تھکے تھکے قدموں کے ساتھ ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے کھڑکی کے قریب آئے اور پھر کھڑکی کے

پاس سے ایک بھاری مردانہ آواز بلند ہوئی۔

حامد نے ایک جھٹکے کے. ساتھ کرسی سے اٹھتے ہوئے باہر کی طرف چھلانگ لگائی اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح تیزی سے باہر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ گیٹ سے باہر سامنے سے آتے ہوئے ایک سائیکل سوار کو اس کے ساتھ ٹکر سے بچنے کے لیے سڑک کے کنارے لگی ہوئی باڑ میں گھسنا پڑا۔

"لو' ہم آ ہی گئے بیگم" گہرے سبز رنگ کی برساتی والے آدمی نے کھڑکی سے اندر چھلانگ لگاتے ہوئے کہا۔ "ہم ہیں تو کیچڑ میں لت پت مگر یہ کیچڑ اب تقریباً" سوکھ گیا ہے--- اور بھئی یہ کون تھا جو ابھی ابھی کمرے سے نکلا ہے؟"

"ایک عجیب و غریب نوجوان" طاہرہ خانم نے کہا " جس کے پاس بات کرنے کے لئے سوائے اپنی بیماری کے اور کوئی موضوع نہیں۔ اور جیسے ہی اس نے تمہیں دیکھا اجازت لیے یا خدا حافظ کہے بغیر ڈر کے یوں بھاگ کھڑا ہوا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو"۔

"میرا خیال ہے وہ کتے کو دیکھ کر ڈر گیا ہوگا" لڑکی نے بڑے سکون اور اطمینان سے کہا "اس نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ وہ کتوں سے بہت ڈرتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک اندھیری رات میں اسے کتوں نے گھیر لیا تھا اور وہ ان سے بچنے کے لئے قبرستان میں جا گھسا تھا۔ کتے وہاں بھی اس کے پیچھے پہنچ گئے تھے۔ ان سے بچنے کے لیے وہ ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں گھس گیا تھا اور ساری رات وہاں خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے گزاری تھی۔ اسی وجہ سے اس کے اعصاب کم زور ہو گئے ہیں اور وہ برسوں کا بیمار دکھائی دیتا ہے"۔

یہ کہہ کر لڑکی اطمینان سے بیٹھ گئی--- اس کی عادت تھی کہ وہ جھٹ پٹ موقع محل کے مطابق کوئی نہ کوئی عجیب قصہ گھڑ لیا کرتی تھی۔ اس کی بات سن کر اس کے خالو جان اور ان کے بھائیوں نے یوں سر ہلایا جیسے وہ ساری بات سمجھ گئے ہوں اور پھر اطمینان سے اندر چلے گئے۔ کیوں کہ انہیں علم تھا کہ اس لڑکی کو گپیں ہانکنے کی عادت ہے۔

Sharjeel Ahmed

مگرمچھ کے آنسو

عبدالستار خان طاہر

ہیو ڈبلیو کلارک برطانیہ کی فوج میں کپتان تھا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ ایک مشہور شکاری بھی تھا۔ اس نے اپنی ایک کتاب میں مگرمچھ کے متعلق لکھا ہے "چوری چھپے وار کرنے والا' ظالم' ڈرپوک' مگر دوسروں کو ڈراتا ہے۔ مکار اور ذہین ہے۔ جو چیز نظر آ جائے کھا جاتا ہے۔ ہر وقت بھوکا دکھائی دیتا ہے۔ ہٹ کا پکا' انسانوں اور بے ضرر جانوروں کے لیے مصیبت بنا رہتا ہے۔ اسے چپ چاپ خشکی پر پڑے دیکھو تو لگتا ہے جیسے مر گیا ہو۔ لیکن شکار کو نگل کر اس طرح گرجتا ہے جیسے اس پر کسی نے بہت ہی بڑا ظلم کیا ہو۔ اس کا منہ بند ہو تو یوں دکھائی دیتا ہے جیسے مسکرا رہا ہو۔ لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو بھی ٹپک رہے ہوتے ہیں۔ کوئی بتا نہیں سکتا کہ وہ ہنس رہا ہے یا رو رہا ہے۔ یہ زیادہ تر پانی میں رہتا ہے لیکن خشکی پر بھی رہ سکتا ہے"۔

ہیو ڈبلیو کلارک کے مگرمچھ کے متعلق یہ تاثرات اس کی تمام شکاری زندگی کا نچوڑ ہیں۔

مگرمچھ واحد درندہ ہے جس سے تمام شکاری نفرت کرتے ہیں۔ یہ اپنے بچوں کو بھی کھا جاتا ہے اور اپنے مرے ہوئے ساتھی کو بھی نگل لیتا ہے۔ جانوروں کے کنبے ہوتے ہیں لیکن مگرمچھ اکیلا زندگی گزارتا ہے۔ اس کی ایسی ہی خصلتوں کی وجہ سے پس ماندہ لوگ مگرمچھ کی پوجا کرتے ہیں اور اسے خوش رکھنے کے لئے نذرانے دیتے رہتے ہیں۔ افریقہ میں جہاں مگرمچھ پائے جاتے ہیں وہاں کسی زمانے میں لوگ ہر سال ایک نوجوان کو مگرمچھوں کے آگے پھینک دیا کرتے تھے۔ ان علاقوں میں یہ قربانی ابھی تک دی جاتی ہے۔ لیکن اب انسانوں کی بجائے بکریوں یا خن زیروں کی دی جاتی ہے۔ سنگاپور' ملایا وغیرہ کے جزیروں میں رہنے والے لوگ مگرمچھوں کو مچھلیاں کھلاتے ہیں۔ پھر ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر دعا کرتے ہیں کہ وہ کسی انسان یا ان کے مویشیوں کو نہ کھائیں۔ لیکن مگرمچھ بھلا کب ان کی سنتے ہیں۔ جب بھی ان کے ہتھے کوئی انسان یا حیوان چڑھتا ہے' وہ اسے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ان کی منتیں اور دعائیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ دلدلی اور قدرتی جھیلوں کے علاقوں کے رہنے والے ہندو بھی مگرمچھ کو "جل دیوتا" سمجھتے ہیں۔ افریقہ میں اسے دریا کا دیوتا کہا جاتا ہے۔

مگرمچھ کے متعلق مشہور ہے کہ کسی انسان یا جانور کی ٹانگ یا بازو اس کے منہ میں آ جائے تو کاٹ کر لے جاتا ہے۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ مگرمچھ کے دانت جنہیں دیکھ کر ڈر لگتا ہے' اس قابل نہیں ہوتے کہ انسان یا کسی جانور کے جسم کا کوئی حصہ کاٹ سکیں۔ یہ دانت صرف پھندے کا کام دیتے ہیں۔ یہ شکار کو صرف پکڑتے ہیں۔ ان میں چبانے اور کاٹنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ مگرمچھ کا صرف اوپر کا جبڑا اوپر نیچے حرکت کر سکتا ہے۔ اس کی زبان میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ شکار کو سموچا حلق سے نیچے اتار دیتی ہے۔ مگر وہ ہر ایک شکار کو فوراً نہیں نگلتا۔ البتہ چھوٹی مچھلیوں' جانوروں انسان کے چھوٹے بچوں کو فوراً نگل لیتا ہے۔ بڑے شکار کو کیچڑ میں دبا دیتا ہے۔ جہاں شکار گلتا سڑتا رہتا ہے۔ جب گل سڑ کر نرم ہو جاتا ہے تو اسے نکال کر نگل لیتا ہے۔ مگرمچھ شکار کو مار نہیں سکتا بلکہ اسے گھسیٹ کر گہرے پانی کی تہ میں لے جاتا ہے اور جب شکار ڈوبنے سے مر جاتا ہے تو اسے کہیں لے جا کر گلنے سڑنے کے لیے دبا دیتا ہے۔

اس کے شکار کی فہرست لامحدود ہے۔ ہاتھی' گینڈے اور جنگلی بھینسے تک کو شکار کر لیتا ہے۔ ہاتھی اس سے اس وقت مار کھاتا ہے جب وہ اس جھیل یا جوہڑ سے اپنی پیاس بجھانے آتا ہے' جہاں مگرمچھ رہتے ہوں۔ جب وہ اس جھیل یا جوہڑ میں پانی پینے کے لئے اپنی سونڈ ڈالتا ہے تو مگرمچھ اس کی سونڈ پکڑ لیتا ہے۔ مگرمچھ کے جبڑوں میں آئی ہوئی چیز کو باہر نکالنا ناممکن ہوتا ہے۔ ہاتھی باہر کو زور لگاتا ہے لیکن درد کی وجہ سے پانی میں چلا جاتا ہے۔ ہاتھی پانی میں زور نہیں لگا سکتا۔ مگرمچھ اسے گھسیٹتے ہوئے گہرے پانی میں لے جاتا ہے جہاں ہاتھی ڈوب کر مر جاتا ہے۔ اور پھر مگرمچھ اسے گلنے سڑنے کے لئے کہیں دبا دیتا ہے۔ جب کچھ دنوں کے بعد ہاتھی گل سڑ جاتا ہے تو پھر وہ اسے بڑے مزے سے ہڑپ کر جاتا ہے۔

کیپٹن ہیو ڈبلیو کلارک اور ایک دوسرے ماہر شکاری رابرٹ رو آرک نے افریقہ میں مگرمچھوں کے متعلق مشاہدے کیے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک جھیل میں دو تین مگرمچھ رہتے تھے۔ یہ دونوں شکاری روزانہ قریب کی ایک چٹان پر چھپ کر بیٹھ جاتے اور مگرمچھوں کو دیکھتے رہتے۔ ایک مگرمچھ خشکی پر یوں بے حس پڑا رہتا تھا جیسے کسی پرانے درخت کا تنا زمین پر پڑا ہو۔ ذرہ بھر حرکت نہیں کرتا تھا۔ ایک روز ایک گینڈا ادھر آ نکلا اور ٹہلتا ٹہلتا مگرمچھ کے قریب سے گزر گیا۔ پانی 20'25 گز دور تھا۔

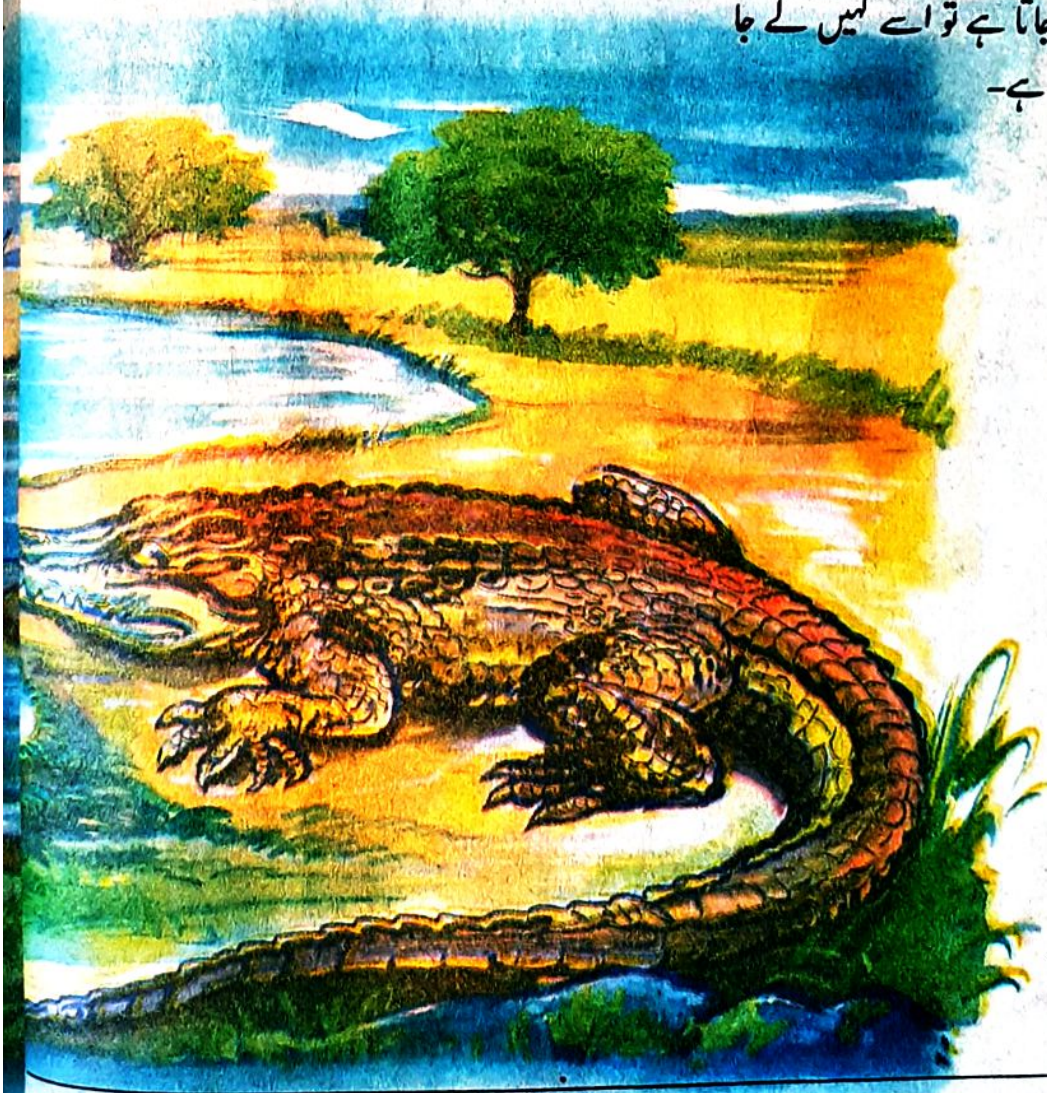

جب گینڈا آگے نکل گیا تو مگرمچھ میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ تھوڑا سا آگے چلا تو اس کے چلنے کی آواز سن کر گینڈا رک گیا۔ مگرمچھ بھی وہیں رک گیا اور اپنا لمبوترا منہ زمین پر لگا دیا' جیسے مر گیا ہو۔ گینڈا واپس آیا اور مگرمچھ کو سونگھنے لگا۔ وہ مگرمچھ کے چاروں طرف گھوما۔ اسے ٹھوکر ماری لیکن مگرمچھ بالکل مردے کی طرح پڑا رہا۔

گینڈے کو یقین ہو گیا کہ یہ مرا ہوا ہے۔ وہ اپنا پاؤں اس کے اوپر رکھ کر گزر گیا۔

حیرت ہے کہ مگرمچھ اتنے زیادہ وزن کے نیچے بھی نہ ہلا۔ گینڈا پانی کی طرف چلا تو مگرمچھ بھی چل پڑا۔ لیکن بہت آہستہ آہستہ۔ گینڈے نے ایک بار پھر رک کر پیچھے دیکھا۔ مگرمچھ وہیں مردہ ہو گیا۔ گینڈا چل پڑا۔ مگرمچھ بھی چل پڑا۔ گینڈا رکا تو مگرمچھ بھی رک گیا۔ دراصل مگرمچھ چاہتا تھا کہ پانی کے قریب جا کر گینڈے کو پکڑے۔ خشکی پر وہ گینڈے جیسے طاقت ور جانور کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

گینڈے کو شک ہوا کہ مگرمچھ زندہ ہے۔ وہ دوڑتا ہوا آیا اور مگرمچھ کو سینگ مارا۔ پھر اسے پاؤں سے ٹھوکریں ماریں۔ منہ سے بڑی خوف ناک آوازیں بھی نکالیں۔ لیکن مگرمچھ شاید واقعی مر گیا تھا۔ گینڈے نے پورا پورا یقین کرنے کے لئے اپنا سینگ مگرمچھ کے پہلو میں رکھا اور زور لگایا تو مگرمچھ الٹ گیا۔ لیکن اب بھی اپنے زور پر مگرمچھ نے کوئی حرکت نہ کی۔ گینڈا اطمینان سے چلا گیا۔ اب پانی قریب آ گیا تھا۔ مگرمچھ سیدھا ہو کر تیزی سے گینڈے کی طرف دوڑا اور قریب جا کر پھر بے سدھ ہو گیا۔ گینڈے نے آخری بار پیچھے مڑ کر دیکھا اور پانی میں اتر کر پانی پینے لگا۔

پھر وہی مگرمچھ جو بظاہر مرا پڑا تھا' تیر کی طرح بھاگا اور گینڈے کی پچھلی ایک ٹانگ اپنے دانتوں میں جکڑ لی۔ گینڈا بھی مگرمچھ کی طرح خشکی اور پانی کا جانور ہے۔ وہ مگرمچھ کی طرح پانی میں ڈبکی لگا سکتا ہے۔ لیکن مگرمچھ اس کی نسبت زیادہ عرصہ پانی کے اندر رہ سکتا ہے۔

گینڈا خشکی کی طرف آیا۔ مگرمچھ بھی اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ گینڈا اسے سینگ مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس کا جسم اس قدر موٹا ہوتا ہے کہ پیچھے کو دہرا نہیں ہو سکتا۔ مگرمچھ نے اس کی آدھی ٹانگ منہ میں جکڑ رکھی تھی۔ گینڈا باہر کو کھینچ رہا تھا اور مگرمچھ پانی کی طرف زور لگا رہا تھا۔ گینڈے نے اب اتنا زور لگایا کہ اس کی اگلی ٹانگیں دہری ہو گئیں۔ مگرمچھ نے پیچھے کو زور لگایا تو گینڈا کھنچتا ہوا پانی میں چلا گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد دونوں پانی کی سطح سے غائب ہو گئے۔

کیپٹن ہیو ڈبلیو کلارک لکھتے ہیں کہ ہم دونوں شام

تک وہاں بیٹھے رہے لیکن نہ گینڈا باہر نکلا اور نہ ہی مگرمچھ۔ دوسرے دن دونوں شکاری پھر وہاں گئے تو انہوں نے دیکھا کہ مگرمچھ پانی سے ذرا دور ایک جگہ گیلی زمین کھود رہا ہے اور مرا ہوا گینڈا قریب ہی پڑا ہے۔ مگرمچھ نے اگلے پنجوں سے گینڈے کے جسم کے مطابق گہری قبر کھود لی اور گینڈے کو منہ اور اگلے پاؤں سے دھکیل کر اس میں پھینک دیا۔ پھر اس پر کیچڑ ڈالنے لگا۔ خاصی دیر لگا کر اس نے گڑھا بھر دیا اور اس کے اوپر لیٹ گیا۔ جیسے مر گیا ہو۔ مگرمچھ کو اب گینڈے کے گلنے سڑنے کا انتظار کرنا تھا۔

کیپٹن ہیو ڈبلیو کلارک اسی کتاب میں ایک دوسرا واقعہ لکھتے ہیں کہ کچھ دنوں بعد چار ہاتھی اسی جگہ پانی پینے آئے۔ اس وقت کوئی مگرمچھ خشکی پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک ایک ہاتھی نے بدک کر ایسی چنگھاڑ ماری کہ جنگل کانپ اٹھا۔ وہ پیچھے ہٹا تو باقی تین ہاتھی بھی تیزی سے پیچھے ہٹے' وہ بہت بے چین تھے اور چنگھاڑ رہے تھے۔ پانی میں مگرمچھ کی تھوتھنی نظر آئی۔ وہ کنارے کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے آگے آ کر ڈبکی لگا دی۔ تین ہاتھی بھاگے اور ایک جو اس کنبے کا سربراہ معلوم ہوتا تھا' کنارے سے ذرا دور کھڑا چنگھاڑتا رہا۔ وہ شاید مگرمچھ کو ڈرا رہا تھا۔ تینوں ہاتھی محفوظ مقام پر چلے گئے ہیں تو وہ بھی جانے لگا۔

وہ تیز تیز جا رہا تھا کہ اچانک اسے ایک مگرمچھ نظر آیا جو اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ یہ مگرمچھ کہیں خشکی پر چھپا ہوا تھا۔ ہاتھی نے بروقت دیکھ لیا اور گھوم کر مگرمچھ کی طرف گیا۔ اب مگرمچھ کے لیے وقت نہیں تھا کہ گینڈے کے شکار والا ڈرامہ کرتا۔ اب تو آمنے سامنے کی لڑائی تھی۔ ہاتھی مگرمچھ کے اردگرد تیزی سے گھومنے لگا۔ وہ سونڈ کو زور سے پٹخ رہا تھا اور چنگھاڑ رہا تھا۔ مگرمچھ بھی ایک جگہ گھوم رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ مگرمچھ کی یہ فطرت ہے کہ وہ آمنے سامنے کی لڑائی سے گریز کرتا ہے۔ مگر اب وہ ہاتھی کے گھیرے میں آ گیا تھا۔ اس نے منہ اوپر اٹھا کر کھولا تو ایسے لگا جیسے ہاتھی کی سونڈ اس کے دانتوں کے آہنی پھندے میں آ جائے گی۔ لیکن ہاتھی زیادہ ذہین اور تیز جانور ہے۔ اس نے اپنی سونڈ بچا کر مگرمچھ کی گردن کے گرد لپیٹ دی اور اسے گھسیٹنے لگا۔ مگرمچھ کا ہتھیار اس کے دانت ہوتے ہیں۔ مگر اب وہ ہتھیار استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

ہاتھی اپنے دشمن کو' خواہ وہ ببر شیر ہی کیوں نہ ہو' سونڈ میں لپیٹ کر اوپر پھینکتا ہے اور جب شکار بہت اوپر جا کر نیچے گرتا ہے تو وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہتا۔ پھر ہاتھی اسے پاؤں کے نیچے کچل دیتا ہے یا اسے ایک بار پھر اٹھا کر

نیچے پھینکتا ہے۔ تاکہ رہی سہی کسر بھی پوری ہو جائے۔

مگرمچھ کو اٹھا کر پٹخنا ممکن نہیں تھا کیوں کہ اس کا وزن بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس نے گھوم کر پاؤں مگرمچھ پر رکھنے کی کوشش کی تاکہ اسے کچل دے مگر وہ جونہی گھوما مگرمچھ نے اپنا دوسرا ہتھیار استعمال کیا۔ یہ تھی اس کی دم۔ اس نے دم اوپر لے جا کر ہاتھی کو ماری تو ہاتھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ مگرمچھ کی گردن ہاتھی کی سونڈ سے نکل گئی۔ ہاتھی مگرمچھ کی دم کے اگلے وار سے بچنے کے لئے پیچھے ہٹا تو مگرمچھ کو موقع مل گیا اور وہ میدان چھوڑ کر پانی کی طرف بھاگ گیا اور ہاتھی جنگل کی طرف دوڑ پڑا۔

مادہ مگرمچھ اگست اور ستمبر کے مہینوں میں انڈے دیتی ہے۔ انڈے کا سائز مرغی کے انڈے جتنا ہوتا ہے۔ ایک مادہ مگرمچھ چالیس سے ستر تک انڈے دیتی ہے۔ وہ پانی کے قریب ریت میں گڑھا کھود کر 12'10 انڈے رکھ دیتی ہے اور اوپر ریت ڈال دیتی ہے۔ اس طرح کے کئی ایک گڑھے کھود کر ان میں انڈے رکھتی اور اوپر ریت ڈالتی رہتی ہے۔ دسمبر کے مہینے میں بچے انڈوں سے نکلنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ اگر ماں قریب ہو تو وہ ہر ایک گڑھے سے ریت ہٹا کر انڈوں سے بچے نکال لیتی ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو بچے خود ہی انڈے توڑ لیتے ہیں۔ پھر وہ ریت سے باہر نکل آتے ہیں۔

پیدائش کے وقت بچے کا سائز 8'7 انچ ہوتا ہے۔ اور اس کے منہ میں پورے دانت ہوتے ہیں۔ قدرتی طور پر بچے پانی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ وہ انڈوں اور ریت سے نکل کر پانی کی طرف بھاگتے ہیں۔ یہ منظر عجیب و غریب اور نہایت دل چسپ ہوتا ہے۔ کہیں سے ریت اوپر کو اٹھتی ہے۔ اندر سے مگرمچھ کا ایک 8'7 انچ کا بچہ نکلتا ہے۔ جو ننھی ننھی ٹانگوں پر پانی کی طرف تیزی سے دوڑتا ہے اور پانی میں جا کر غائب ہو جاتا ہے۔ دسمبر میں بے شمار بچے دوڑتے اور پانی میں غائب ہوتے نظر آتے ہیں۔

ان کی ماں ان کی تربیت میں کوئی سرگرمی نہیں دکھاتی۔ نہ انہیں دودھ پلاتی ہے اور نہ انہیں تیرنا سکھاتی ہے بلکہ انہیں نظر انداز ہی کر دیتی ہے۔ بچے بھی ماں کو نہیں ڈھونڈتے۔ البتہ ان کے والد ان کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ بچے ان کے لئے زود ہضم غذا ہوتی ہے۔

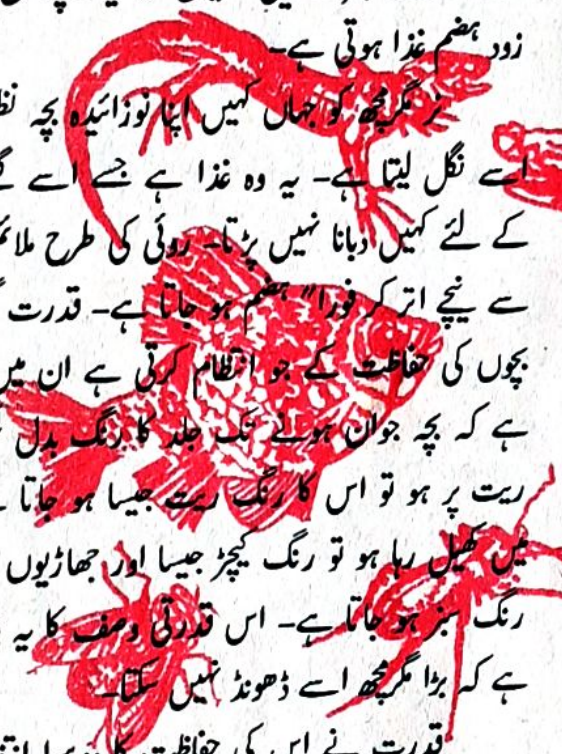

مگرمچھ کو جہاں کہیں اپنا نوزائیدہ بچہ نظر آتا ہے اسے نگل لیتا ہے۔ یہ وہ غذا ہے جسے اسے گلنے سڑنے کے لئے کہیں دبانا نہیں پڑتا۔ روئی کی طرح ملائم بچہ حلق سے نیچے اتر کر "فوراً" ہضم ہو جاتا ہے۔ قدرت مگرمچھ کے بچوں کی حفاظت کے جو انتظام کرتی ہے ان میں ایک یہ ہے کہ بچہ جوان ہونے تک جلد کا رنگ بدل سکتا ہے۔ ریت پر ہو تو اس کا رنگ ریت جیسا ہو جاتا ہے۔ کیچڑ میں کھیل رہا ہو تو رنگ کیچڑ جیسا اور جھاڑیوں میں ہو تو رنگ سبز ہو جاتا ہے۔ اس قدرتی وصف کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ بڑا مگرمچھ اسے ڈھونڈ نہیں سکتا۔

قدرت نے اس کی حفاظت کا دوسرا انتظام یہ کیا ہے کہ اسے دوسرے بچوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی حس عطا فرمائی ہے۔ مگرمچھوں کے بچے جوانی تک اکٹھے رہتے ہیں۔ اگر ان کے کچھ ساتھی بکھر جائیں تو اس قدر شور بپا کرتے ہیں کہ تمام بچے دور دور سے آ کر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ بڑے مگرمچھ چھوٹے مگرمچھوں کے ہجوم سے ڈرتے ہیں۔ اس لیے ان کے قریب نہیں آتے۔ جب بچے جوان ہو کر بڑے مگرمچھوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو ان کا آپس کا پیار ختم ہو جاتا ہے۔

بچپن میں مگرمچھ چیونٹیاں، کیڑے مکوڑے، چھوٹی مچھلیاں، چوہے اور مینڈک کھاتا ہے۔ ایک سال بعد اس کی لمبائی 18 انچ ہو جاتی ہے جو 9 انچ سالانہ کے حساب سے بڑھتی ہے۔ جوانی میں 7 فٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس عمر میں اس کی جلد کا رنگ مستقل طور پر سیاہی مائل ہو جاتا ہے۔ مگرمچھ کی اوسط لمبائی تقریباً 15 فٹ ہوتی ہے۔

انتہائی لمبائی 18 فٹ بھی دیکھی گئی ہے۔ مادہ کی لمبائی 13 فٹ تک رہتی ہے۔ وزن 13 سے 15 من تک ہوتا ہے۔

مگرمچھ کی عمر کی صحیح حد ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مگرمچھ کئی سو سال تک زندہ رہتا ہے اور یہ ایسا جانور ہے جو بوڑھا ہو کر نہیں مرتا۔ اس کی موت کسی شکاری کے ہاتھوں یا آپس میں لڑ کر واقع ہوتی ہے۔ اگر جھیل خشک ہو جائے اور قریب کوئی اور جھیل نہ ہو تو مگرمچھ سرنگ بنا لیتا ہے جس کی لمبائی تقریباً 18 فٹ ہوتی ہے۔ سرنگ کے اندر والے سرے پر وہ کھلی جگہ بنا لیتا ہے اور وہاں خوراک اور پانی کے بغیر لمبے عرصے تک زندہ رہتا ہے۔ سرنگ کے باہر والے سرے کو بند رکھتا ہے۔ ڈیڑھ دو سال بعد بھی اگر جھیل میں پانی آ جائے تو وہ سرنگ سے باہر آ جاتا ہے۔ اگر پانی نہ آئے اور مگرمچھ کو بھوک تنگ کرے تو وہ باہر آ کر خشکی پر دور تک چلا جاتا ہے۔ اسے کوئی ساتھی مگرمچھ نظر آ جائے تو اس پر پل پڑتا ہے۔ ان کی لڑائی زندگی اور موت کی لڑائی ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ ایک دوسرے کو شکست دینے کی خاطر نہیں بلکہ ایک دوسرے کو کھانے کی خاطر لڑتے ہیں۔ اس لیے ایک نہ ایک کو مرنا ہوتا ہے۔ جو جیت جاتا ہے وہ مرے ہوئے مگرمچھ کو گھسیٹ کر لے جاتا ہے اور کوئی موزوں جگہ ڈھونڈ کر اسے دبا دیتا ہے۔ جب وہ گل سڑ جاتا ہے تو اسے فاتح مگرمچھ نگل لیتا ہے۔ مگرمچھ اتنا ڈرپوک ہوتا ہے کہ لڑائی سے بھاگ نکلنے میں کام یاب ہو جائے تو لمبی مدت تک بھاگتا ہی رہتا ہے۔ اور ایسے پانی کے قریب بھی نہیں جاتا جہاں کوئی اور مگرمچھ موجود ہو۔

دریا میں مگرمچھ کشتیوں پر حملہ کرتا ہے۔ اس حملے میں وہ اپنی دم استعمال کرتا ہے۔ کشتی والوں کو شک بھی نہیں ہوتا کہ ان کے نیچے ان کی موت تیرتی آ رہی ہے۔ وہ موزوں پوزیشن میں آ کر بجلی کی تیزی سے دم پانی سے باہر نکال کر اتنی زور سے کشتی پر مارتا ہے کہ کشتی ٹوٹ جاتی ہے۔ جو کشتی سوار دم کی زد میں آ جائیں وہ فوراً ہلاک ہو جاتے ہیں اور باقی ڈوب جاتے ہیں۔ صرف وہی بچ پاتے ہیں جو تیرنا جانتے ہیں اور مگرمچھ کی پہنچ سے دور ہو جاتے ہیں۔

پانی میں مگرمچھ کی رفتار کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ببر شیر جسے جنگل کا بادشاہ کہا جاتا ہے اور جس کی بو پا کر درندے بھاگ جاتے ہیں، جب دریا پار کرنا چاہے یا دریا سے پانی پینے لگے تو پہلے سونگھتا ہے۔ اگر اسے مگرمچھ کی بو آ جائے تو وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔

مگرمچھ کے پیٹ میں جنگلی بھینسوں کے سینگ اور ہڈیاں تک گل جاتی ہے۔ اس کے معدے میں ہضم کرنے والے تیزاب اس قدر تیز ہوتے ہیں کہ گینڈے کا سینگ بھی گل جاتا ہے۔ کیپٹن کلارک نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جس مگرمچھ نے گینڈے کو مارا اور ہاتھی کو بھگایا تھا اسے تین مہینے بعد ہم نے گولی سے مارا۔ اس کے پیٹ سے بڑے بڑے پتھر نکلے۔ اس نے گینڈے کو بھی نگل لیا تھا۔ کیوں کہ گینڈے کی ہڈیاں، سینگ اور کھوپڑی ابھی تک مگرمچھ کے پیٹ میں موجود تھیں۔ اس کے پیٹ سے ایک انسانی کھوپڑی بھی برآمد ہوئی جو کسی حبشی کی تھی۔

مگرمچھ جب شدید زخمی ہو جاتا ہے تو وہ مرنے کے لئے پانی کی تہ میں یا پانی سے نکل کر خشکی پر کہیں چلا جاتا ہے۔ وہاں آرام سے لیٹ جاتا ہے پھر کچھ عرصے بعد مر جاتا ہے۔ اگر پانی میں مرے تو 8، 10 دن تہ میں پڑا رہتا ہے۔ اس کے بعد اس کا مردار اوپر آ جاتا ہے اور کسی دوسرے مگرمچھ کے پیٹ میں چلا جاتا ہے۔

اگر افریقہ کا حبشی یا کوئی ماہر شکاری جو درندوں کی خصلتوں کو سمجھتا ہو، مگرمچھ کی تعریف کرے تو سمجھ لیجئے کہ وہ مکار اور جھوٹا آدمی ہے اور وہ "مگرمچھ کے آنسو" بہا رہا ہے۔ اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ مگرمچھ کی طرح آنسو بہانا کوئی اچھی عادت نہیں۔

کایا پلٹ

Sharjeel Ahmed

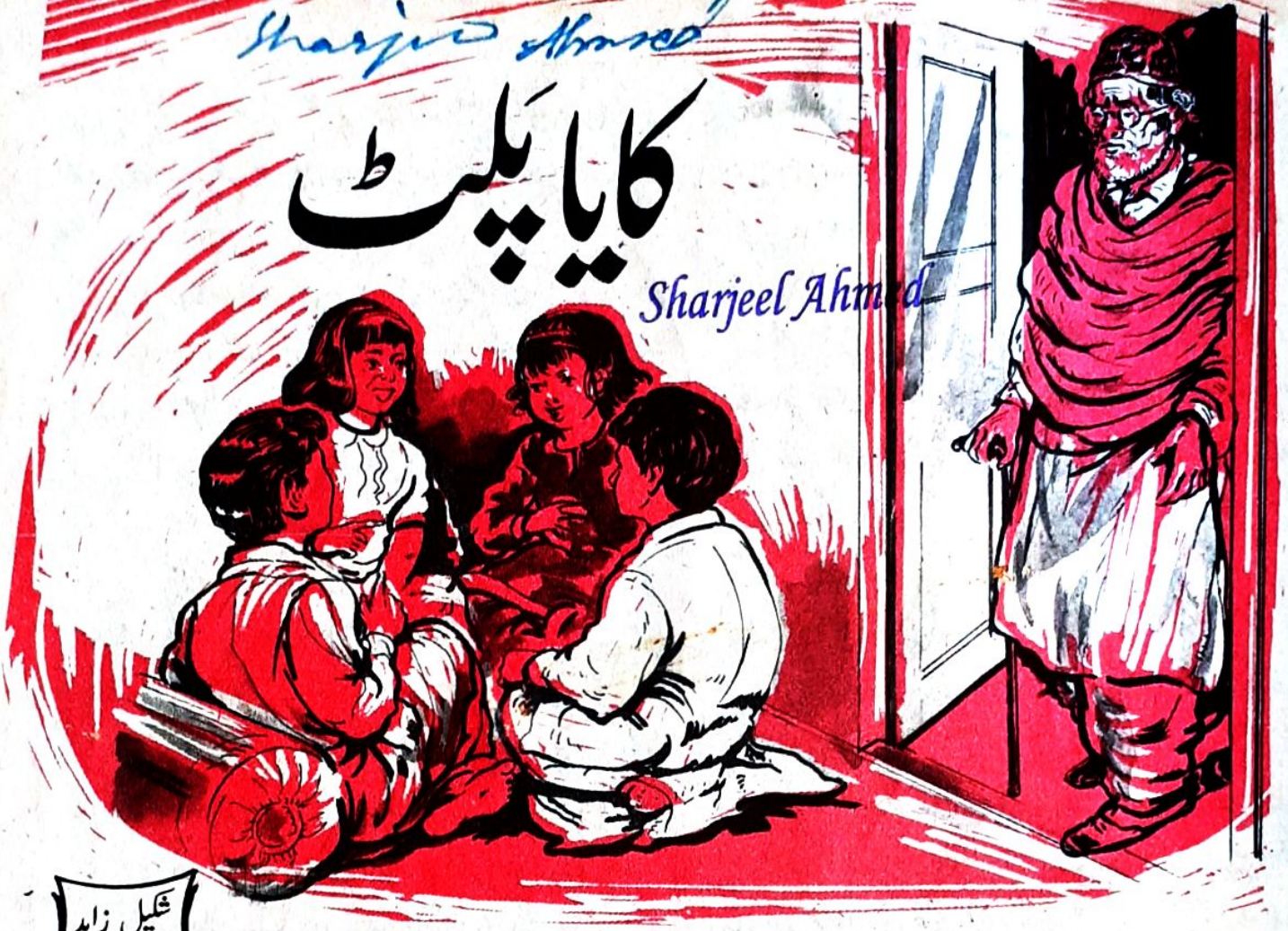

شکیل زاہد

بچوں کے شور کی آواز جب زیادہ بلند ہو گئی تو دادا جان نے اپنی کتاب ایک جانب رکھی اور بستر سے اٹھ کر بچوں کے کمرے کے دروازے پر گئے۔ کمرے میں چار بچے تھے' دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔ ان کی عمر میں 12'13 سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ ان کی آواز تو بہت اونچی تھی لیکن بات ایک کی بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

اچانک ایک بچے کی نظر دروازے پر کھڑے دادا جان پر پڑی۔ اس نے فوراً" دوسرے بچوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے پلٹ کے دادا جان کی طرف دیکھا اور جھینپ کر چپ ہو گئے۔ دادا جان مسکرائے۔ پھر وہ کمرے میں داخل ہوئے اور بچوں کے پاس بیٹھ گئے۔

"کیوں بھائی' کیا مسئلہ ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

چاروں بچے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو بولنے کے لیے کہا۔ مگر کوئی نہ بولا۔

"ہاں ہاں بتاؤ بھئی کیا ہوا؟ اچھا ہادی تم بتاؤ" انہوں نے ایک لڑکے سے کہا جو ان میں بڑا لگتا تھا۔

دادا جان' یہ کیا بتائے گا۔ سارا مسئلہ تو اس کا کھڑا کیا ہوا ہے" شمائلہ نے کہا۔ وہ ہادی کی چھوٹی بہن تھی۔

"کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کیا۔ تم خواہ مخواہ ہی جھگڑ رہے ہو" دوسرے لڑکے جس کا نام رحمان تھا' نے کہا۔ وہ ہادی کے چچا کا بیٹا تھا۔

"ارے بھئی لڑو نہیں" دادا جان نے بیچ میں دخل دیا "مجھے بتاؤ کیا معاملہ ہے؟"

"دادا جان میں بتاتی ہوں" شمائلہ نے کہا "ہم آج چائنیز جا رہے ہیں' دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے۔ چھوٹے چچا ہمارے ساتھ ہوں گے۔ ہادی کا کہنا ہے کہ ہم کھانے کا بل نہیں بنوائیں گے۔ اس طرح ہمیں ایکسائز ڈیوٹی ادا نہیں کرنی پڑے گی اور بل کم بنے گا"۔

"تو جھگڑا کس بات پر ہو رہا ہے؟" دادا جان نے پوچھا۔

"اس بات پر" شمائلہ نے کہا "میں کہتی ہوں کہ یہ غلط بات ہے بلکہ چوری ہے۔ مگر یہ دونوں میری بات سنتے ہی نہیں"۔

دادا جان کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولے "اس مسئلے کے حل کے لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ایکسائز ڈیوٹی دینے میں کس کا فائدہ ہے؟"

"ہمارا تو ہرگز نہیں ہے" ہادی نے کہا۔

"حکومت کی جیب میں جاتے ہیں پیسے" رحمان بولا۔

"لیکن حکومت کسی انسان کا نام تو نہیں جس کی جیب میں جا رہے ہوں۔ اصل میں تو پاکستان کی جیب میں جا رہے ہیں" شمائلہ نے کہا۔

"تو پاکستان کون سا کسی انسان کا نام ہے" رحمان نے کہا "دادا جان سیدھی سی بات ہے' ایکسائز ڈیوٹی نہ دینے میں ہمارا فائدہ ہے اس لیے ہم نہیں دیں گے"۔

دادا جان نے غور سے رحمان کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی تھی۔ یہ چمک اتنی تیز تھی کہ رحمان نے نظریں جھکا لیں۔

"چائنیز میں کھانے کا کتنا بل بنے گا؟" دادا جان نے پوچھا۔

"تقریباً" 500 روپے" ہادی نے کہا۔

"چلو میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن دادا جان وہ بل والی بات؟" شمائلہ نے کہا۔

"وہ بھی دیکھ لیتے ہیں' پہلے کہانی تو سن لو"۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے" رحمان بولا "کہانی سنتے ہیں"۔

"تم چاروں بچوں کے والد نیاز اور شہباز ڈاکٹر اور انجینئر ہیں۔ تمہارے دادا یعنی میں' ایک بڑے سرکاری افسر ہوتے تھے۔ کیا تم جانتے ہو کہ جب میں دس سال کا تھا تو کیا تھا؟"

"نہیں" تمام بچے بولے۔

"میں ایک کمی ہوتا تھا۔ کمی اس شخص کو کہا جاتا تھا جو دوسروں کے کھیت میں کام کرتا تھا اور معاوضے میں اناج وغیرہ لیتا تھا۔ وہ زمین دار کے دوسرے کام کرنے کا بھی پابند ہوتا ہے۔ میرے والد جنہیں ہم بھاہ جی کہتے تھے ایک ہندو کے کھیت میں کام کرتے تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے ہم مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں چک دیال میں رہتے تھے۔ یہ گاؤں سلطان پور اور ہری کے بیراج کے درمیان واقع تھا۔ بھاہ جی اور اعجاز بھاہ یعنی میرے ابا اور میرے بڑے بھائی دونوں کرشن ہرگوپال کے کمی تھے۔ کرشن ہرگوپال ایک بہت بڑا زمین دار تھا اور کٹر ہندو تھا۔ ہم اس کے کمی تو تھے ہی لیکن وہ ہمیں اچھوت بھی سمجھتا تھا۔ جب بھی وہ بھاہ جی سے کوئی بات کرتا تو 10 فٹ کے فاصلے پر کھڑا رہتا۔

"ہم لوگ بے حد غریب تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم اکثر صرف ایک وقت کا کھانا کھاتے تھے۔ کھانے میں ہمیں پیاز اور مرچوں کی چٹنی ملتی تھی۔

"ہم جدی پشتی کمی تھے یعنی میرے دادا بھی کمی تھے اور ان کے دادا بھی۔ چک دیال میں ہم برسوں سے رہ رہے تھے۔ اسی لیے وہاں کے ہندو زمین دار اپنے کھیتوں میں ہم سے کام کروا لیا کرتے تھے۔ ورنہ مسلمانوں کو تو ہاتھ لگانے سے ان کا دھرم بھرشٹ ہو جاتا تھا۔ گاؤں میں چار گھر مسلمانوں کے تھے۔ یہ سب کمی تھے۔ باقی سارا گاؤں ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھا۔

"کھیت میں کام کرنے کے علاوہ ہم کرشن ہرگوپال کے مویشیوں کو نہلایا بھی کرتے تھے۔ گوبر کے اپلے بناتے تھے۔ گندم کے دانے بھوسے سے علیحدہ کرتے تھے۔

ہم سب چٹے ان پڑھ تھے۔ ہمارے گاؤں میں ایک اسکول تھا لیکن مسلمانوں کے اسکول جانے پر پابندی تھی۔ وہاں صرف ہندوؤں کے بچے پڑھتے تھے۔ کچھ سکھ بھی اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے بھیج دیا کرتے تھے"۔

دادا جان اپنے ماضی میں گم ہو گئے تھے۔ وہ روانی سے اپنی کہانی سنا رہے تھے۔ چاروں بچے نہایت انہماک سے

کہانی سن رہے تھے۔ انہیں پہلی بار اپنے بڑوں کی حقیقت کا علم ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے حیرت میں گم تھے۔

"جب پاکستان بنا تو ہمیں اس کے متعلق زیادہ علم نہ تھا۔ بس یہ جانتے تھے کہ مسلمان ایک علیحدہ ملک بنا رہے ہیں۔ مگر بھاہ جی نے پاکستان جانے سے صاف انکار کر دیا تھا"۔

"مگر کیوں دادا جان؟" شمائلہ نے ٹوکا "وہاں تو آپ لوگوں کی اتنی بری زندگی تھی"۔

"اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو ہم جدی پشتی وہاں کے رہنے والے تھے۔ وہاں ہمارے بڑوں کی قبریں تھیں۔ ہم وہاں سے نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ دوسرے ہم اس بری زندگی کے عادی تھے۔ ہمیں پتا ہی نہیں تھا کہ اچھی زندگی کیا ہوتی ہے۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ چوں کہ ہم کمی ہیں لہٰذا ہمارے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ جو ہو رہا ہے' ٹھیک ہو رہا ہے۔

"پھر ایک رات بھاہ جی گھر آئے تو بہت پریشان تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہر طرف مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا جا رہا ہے۔ سکھ اس کام میں پیش پیش ہیں۔ بھاہ جی نے بتایا کہ اپنے گاؤں کے سکھوں کے تیور بھی اچھے نہیں ہیں۔ مہندر سنگھ جو گاؤں کا سب سے عمر رسیدہ ہے' نے بھاہ جی سے کہا تھا کہ وہ جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں۔ سکھوں کو روکے رکھنا اس کے بس میں نہیں رہے گا۔ ہم چاروں یعنی بھاہ جی' بی بی' جو ہماری والدہ تھیں' اعجاز بھاہ اور میں اسی رات اپنا مختصر سا سامان لے کر اپنے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

بھاہ جی بہت دیر تک گلی کے نکڑ پر کھڑے ہو کر اپنے گھر کو دیکھتے رہے۔ اس گھر میں ان کی ساری زندگی گزری تھی۔ ان کے والد کی بھی ساری زندگی یہیں گزری تھی۔ ذرا فاصلے پر مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔ یہاں ہمارے آباؤ اجداد کی قبریں تھیں۔ ہم وہ سب چھوڑ کر جا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ بھاہ جی کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ میں نے پہلی بار انہیں روتے دیکھا تھا۔

"سلطان پورہ تک کا فاصلہ ہم نے پیدل طے کیا۔ وہاں تک پہنچتے صبح ہو گئی تھی۔ بی بی تھک کے چور ہو گئی

تو ہم ایک سڑک کے کنارے زمین پر بیٹھ گئے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ سلطان پورہ سے امرتسر کے لیے بس پکڑیں گے۔ سنا تھا کہ امرتسر سے لاہور کے لیے ریل گاڑی چلتی ہے۔ ہم نے کبھی ریل گاڑی نہیں دیکھی تھی۔ بس میں بھی میں اس دن پہلی بار سوار ہوا تھا۔

"بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ بی بی کو تو بیٹھنے کی جگہ مل گئی مگر ہم تینوں کھڑے ہی رہے۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم کتنی دیر میں امرتسر پہنچے مگر اتنا یاد ہے کہ وہ کافی طویل سفر تھا۔ امرتسر پہنچے تو لگتا تھا کسی بھوتوں کی بستی میں آ گئے ہیں۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ بس ڈرائیور نے یہ حالت دیکھی تو بس اڈے پر لے جانے کے بجائے وہیں سے واپس موڑ لی۔ مسافر اتر کر تتر بتر ہو گئے۔ ذرا سی دیر میں پھر سناٹا چھا گیا۔

ہمیں کچھ پتا نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے۔ ریل گاڑی کہاں سے ملتی ہے۔ ہم چاروں اپنا سامان اٹھائے یونہی چل پڑے۔ ایک چوک میں پہنچے تو ہمیں ایک گھر سے شعلے نکلتے نظر آئے۔ تین چار آدمی بھی نظر آئے جو تیز تیز چلتے ہوئے جلد ہی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اس دن میں نے زندگی میں پہلی بار لاشیں دیکھیں۔ سڑک پر اور فٹ پاتھ پر انسانی لاشیں اپنے خون میں نہائی پڑی تھیں۔ مجھ پر خوف غالب آنے لگا۔ بی بی منہ پر کپڑا لپیٹے تیز تیز چل رہی تھیں۔

اچانک قریب سے "ست سری اکال" کا فلک شگاف نعرہ سنائی دیا پھر آواز آئی۔ "راج کرو گا خالصہ' باقی رہے نہ کو"۔

"ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہ سکھ ہی ہیں۔ انسانی لاشیں دیکھ کر ہم پہلے ہی دہشت زدہ تھے۔ یہ نعرے سن کر ہمارے اوسان بالکل ہی خطا ہو گئے۔ ہم تیزی سے ایک تنگ گلی میں گھس گئے۔ میں اور اعجاز بھاہ آگے تھے۔ بھاہ جی بی بی کو پکڑے ہوئے پیچھے تھے۔ ہم دونوں

Sharjeel

کے درمیان ذرا فاصلہ تھا۔ اچانک کہیں سے تین سکھ ہاتھوں میں کرپانیں لہراتے آ دھمکے۔ وہ ہمارے اور بھاہ جی کے درمیان تھے۔ بی بی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ اور بھاہ جی رک گئے۔ سکھوں نے ان کو غور سے دیکھا۔

"مسلے لگتے ہیں" ایک بولا۔

"کاٹ دو" دوسرے نے کہا۔

"اگلے ہی لمحے ان کی کرپانیں اٹھیں اور آن واحد میں انہوں نے بھاہ جی اور بی بی کے جسموں میں اتار دیں"۔

دادا جان کی آواز رندھ گئی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ چند لمحے خاموش کھڑے اپنے آنسو خشک کرتے رہے۔

"اعجاز بھاہ نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ورنہ میری چیخ سے سکھ ہماری طرف بھی متوجہ ہو جاتے۔ ہم اندھیرے میں دم سادھے کھڑے رہے۔ جب سکھوں کو یقین ہو گیا کہ دونوں مر چکے ہیں تو انہوں نے "واہ گرو کی فتح" کا نعرہ لگایا اور گلی سے نکل گئے۔

"ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بھاہ جی اور بی بی کے پاس پہنچے۔ ہم کافی دیر تک وہاں کھڑے روتے رہے پھر اعجاز بھاہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور کھینچتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ ہمارا سامان بھاہ جی اور بی بی کے پاس ہی پڑا رہا۔ ہمیں اسے اٹھانے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ خوف اور دہشت کی وجہ سے میری زبان بند ہو گئی۔ میں ایک سال گونگا رہا۔ زبان کھلنے کے بعد دو سال تک میں ہکلا کر بولتا تھا۔

"ہم دونوں بھائی پاکستان کی طرف چل پڑے۔ ہم نے کچھ فاصلہ بس کی چھت پر طے کیا' کچھ بیل گاڑی پر اور باقی پیدل۔ ہمیں ہر دم یہی خوف رہتا کہ ابھی کسی طرف سے سکھ آئیں گے اور ہمیں مار ڈالیں گے۔ میں راتوں کو سوتے میں چیخ مار کر اٹھ جاتا۔ اعجاز بھاہ مجھے سینے سے لگائے بیٹھے رہتے۔ پاکستان پہنچے تو ہمیں ایسا لگا جیسے اپنی ماں کی گود میں آ گئے ہوں۔ ہم وہیں زمین پر بیٹھ کر رونے لگے۔ ہمیں بھاہ جی اور بی بی یاد آ رہے تھے۔ اس وقت ہم دونوں ننگے پاؤں تھے اور بدن پر کپڑوں کا صرف ایک جوڑا تھا۔ یہ وہ سامان تھا جو ہم اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔

"لاہور آ کر ہم دونوں بھائیوں نے ایک صاحب کے گھر میں نوکری کر لی۔ ہم سارا دن گھر کا کام کرتے اور رات کو پڑھتے۔ اعجاز بھاہ نے بی اے کیا تو انہیں ایک سرکاری نوکری مل گئی۔ ہم نے ان صاحب کی نوکری چھوڑ دی اور ایک کمرا کرائے پر لے لیا۔ پھر میں نے بی اے کے بعد مقابلے کا امتحان دیا اور پاس ہو کر سرکاری افسر بن گیا۔

آج اللہ کے فضل سے ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ یہاں ہماری کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ ہم کیا تھے اور آج کیا ہو گئے ہیں۔ یہ سب پاکستان کی بدولت ہے کہ ہم آج عزت کی زندگی گزار رہے ہیں اور تم لوگ چائنیز جانے کا سوچ رہے ہو۔ ورنہ ہم نے بھی کمی رہنا تھا اور ہمارے بچوں نے بھی۔ اور ہندو بنیے کی غلامی کرنی تھی۔ مگر آج وہ پڑھے لکھے عزت دار شہری ہیں۔

"اب مجھے ایک بات بتاؤ" دادا جان نے رحمان کی طرف دیکھ کر کہا "جس ملک کے شہری ہونے کے باعث تمہیں اتنا کچھ ملا تمہیں پیاز اور مرچوں کی چٹنی کے بجائے اللہ کی اتنی نعمتیں ملیں۔ تم ایک وقت کے کھانے پر 500 روپے خرچ کرنے کے قابل بنے۔ اگر اس میں سے 50'40 روپے اس ملک کو دے دو گے تو کیا بری بات ہے؟ میری بات یاد رکھو' اگر یہ ملک نہ بنا ہوتا تو ہم اب بھی کمی ہوتے اور ہندو زمین داروں کے مویشیوں کے گوبر کے اپلے بنا رہے ہوتے"۔

چاروں بچے گم صم بیٹھے تھے۔ ان کے خوب صورت چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ لگتا تھا ان کی بھی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔

☆ اُستاد (شاگرد سے) : چلتی گاڑی سے کب اُترنا چاہیے؟

شاگرد (معصومیت سے) : جب وہ ہسپتال کے قریب ہو۔

☆ مشرقی جرمنی کے ایک قصبے کے قریب ہی ایک سرکاری باغ کے چاروں طرف خار دار تاروں کا جال لگایا گیا تھا اور اس میں برقی رو دوڑا دی گئی تھی۔ اِس تار کے ساتھ ایک بورڈ لگایا گیا تھا۔ جس پر یہ الفاظ تحریر تھے "جو کوئی اِسے چھوئے گا وہ فی الفور ختم ہو جائے گا"۔ اِس تحریر کے نیچے یہ الفاظ لکھے تھے " خلاف ورزی کرنے والے کو ایک ہفتہ قید کی سزا دی جائے گی"۔ (محمد سعید رضا خاکوانی بورے والا)

☆ ایک شخص نوکری کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ آخر ایک دفتر میں گیا۔ وہاں کے افسر نے پُوچھا "تمہیں پڑھنا لکھنا آتا ہے"۔

اُس نے کہا "مجھے لکھنا آتا ہے، پڑھنا نہیں"۔

"چلو پھر لکھو" افسر نے یہ کہنے کے بعد چند الفاظ بولے۔ پھر اُس نے کہا "دکھاؤ کیا لکھا ہے"۔

کاغذ پر چند لکیریں لگی ہوئی تھیں۔ اِس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ افسر نے پریشان ہو کر کہا "اِسے پڑھو کیا لکھا ہے"۔

وہ شخص بولا "جناب میں نے آپ کو پہلے ہی کہا تھا کہ مجھے لکھنا آتا ہے پڑھنا نہیں" (حمیرا احسن لاہور)

☆ بحریہ کے ایک الیکٹریشن کو بجلی کے تار درست کرتے ہوئے سخت جھٹکا لگا۔ اُسے علاج کے لیے ہسپتال داخل کرانا پڑا۔ اِنچارج الیکٹریشن اُسے ہسپتال دیکھنے کے لیے آیا۔ جھٹکے کا واقعہ سُن کر اُس پر خفا ہوا: اَرے بے وقوف، تم نے مین سوئچ کیوں نہیں بند کیا تھا؟

الیکٹریشن اِطمینان سے بولا: جناب، میں نے ایک بار آپ کو دیکھا تھا، آپ نے وہی تار پکڑا ہوا تھا جس سے مجھے جھٹکا لگا۔ آپ نے بھی مین سوئچ بند نہیں کیا ہوا تھا اور آپ صرف ایک ٹانگ پر کھڑے تھے مگر آپ کو تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

"پگلے میں جس ٹانگ پر کھڑا تھا وہ لکڑی کی ہے"۔ انچارج مُسکرا کر بولا (عرفان افضل، سیال کوٹ)

☆ ہوٹل میں گاہک نے ویٹر کو نہایت نخوت سے بُلایا اور کہا "دیکھو دو فرائی انڈے لاؤ۔ نہ زیادہ کچّے ہوں نہ زیادہ پکّے۔ اِنہیں اُلٹے مت کرنا۔ گھی زیادہ مت ڈالنا۔ دونوں پر ذرا سا نمک ڈالنا۔ کالی مرچ مت چھڑکنا۔ زردی سخت نہ ہونے دینا۔ نیچے سے جلے ہوئے نہ ہوں۔ زردی پھٹنی بھی نہیں چاہیے"۔

آرڈر سُننے کے بعد ویٹر کھڑا رہا تو اُن صاحب نے غُصّے سے کہا "کھڑے مُنہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ لے آؤ ناں"۔

ویٹر نے پُوچھا "سر انڈے کس رنگ کی مُرغی کے ہونے چاہئیں" (جہانگیر مسعود، اسلام آباد)

Sharjeel Ahmed

بہار

جب چمن میں بہار آتی ہے سینکڑوں پھول یہ کھلاتی ہے
ہر کلی مسکرانے لگتی ہے زندگی، گیت گانے لگتی ہے
خوش بوؤں سے فضا مہکتی ہے ہر طرف آگ سی دہکتی ہے
قطرے شبنم کے یوں چمکتے ہیں موتیوں کی طرح دمکتے ہیں
جوہی، چمپا، چنبیلی اور گلاب لگتے ہیں کیا حسین اور شاداب
پتیوں پر نکھار آتا ہے مُردہ دِل کو قرار آتا ہے
کوئلیں گیت گانے لگتی ہیں بلبلیں چہچہانے لگتی ہیں
پھول سب پیارے پیارے لگتے ہیں رُوح پرور نظارے لگتے ہیں
امن و چاہت کا پیار کا موسم
پیارا پیارا بہار کا موسم

ضیغم حمیدی

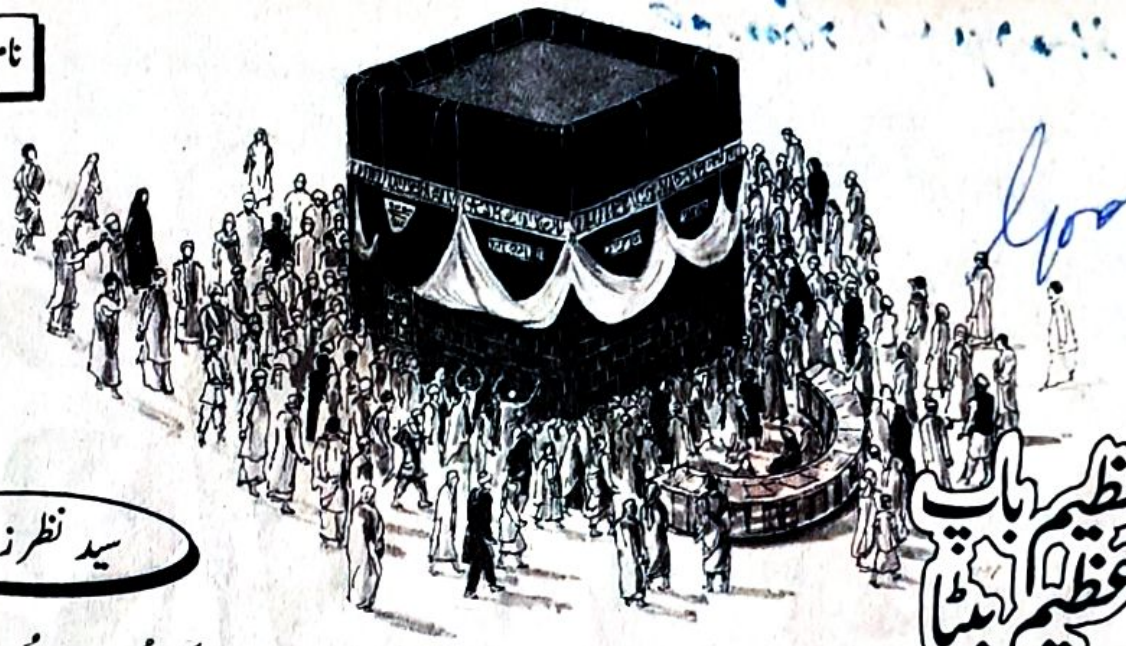

عظیم باپ عظیم بیٹا

سید نظر زیدی

پُوری دنیا کے مسلمان بقر عید یا عِیدُالاضحیٰ کے مُقدّس تہوار پر جانوروں کی قُربانی دیتے ہیں۔ یہ دراصل اِسلامی تاریخ کے اُس عظیمُ الشّان واقعے کی یادگار ہے جس کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور ان کے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السّلام سے ہے۔

نبیوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بُہت بڑا دَرجہ ہے۔ ابو الانبیاء، یعنی نبیوں کے باپ اور خلیل اللہ، یعنی اللہ کا دوست ان کے القاب ہیں، یہ درجہ انہیں اس لیے ملا کہ انہوں نے اللہ کے سب حکموں کو سچّے دِل سے مانا اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے ہر قسم کی قربانی دی۔ یہاں تک کہ اپنے اُس بیٹے کو قربان کرنے کے لئے تیّار ہو گئے جو اُس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب وہ بوڑھے ہو گئے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کوئی چار ہزار برس پہلے مُلک عراق کے شہر اُر میں پیدا ہوئے تھے۔ اُس زمانے میں اِس مُلک پر ایک بُہت ظالم بادشاہ حکومت کر رہا تھا جس کا نام نَمرود تھا۔ طاقت کے نشے میں وہ اِتنا مغرور ہو گیا تھا کہ خُدا ہونے کا دَعویٰ کرتا تھا۔ اُس نے اپنے بُت مَندروں میں رکھوا دیئے تھے اور حُکم دیا تھا کہ سب اِن کی پوجا کیا کریں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہ صرف نمرود کی خدائی کے دعوے کو غلط بتایا، بلکہ اُسے اور اُس کی رعایا کو اُن بُرائیوں سے روکا جِن میں وہ پھنسے ہوئے تھے۔ آپ نے سچّے خُدا کی عبادت کرنے کی تعلیم دی اور نیکی کے کام کرنے کے تبلیغ کی۔

نَمرود اور اُس کے دَرباری آپؑ کے دُشمن بَن گئے۔ اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ آگ کا الاؤ جلا کر آپؑ کو اس میں پھینک دیا جائے۔

اِس فیصلے پر عمل ہوا، لیکن اللہ نے آپؑ کو بچا لیا۔ پھر اُن ظالموں نے آپؑ کو جلا وَطن کر دیا۔ نیکی کے راستے پر چلتے ہوئے جتنی آزمائشیں بھی آئیں آپؑ نے خوشی سے قبول کیں۔

آپؑ نے کعبہ شریف کو نئے سِرے سے تعمیر کیا اور حج کا انتظام فرمایا۔ کعبہ دُنیا کی سب سے پہلی عبادت گاہ ہے جو حضرت آدم علیہ السّلام نے تعمیر کی تھی۔ حضرت نوح علیہ السّلام کے زمانے میں طوفان آیا تو یہ عبادت گاہ بھی باقی نہ رہی۔ اسے حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور آپؑ کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے دوبارہ تعمیر کیا اور اللہ کے حُکم سے یہ اعلان کیا کہ لوگ حج کرنے کے لیے مکّہ آئیں۔ اُس وقت سے یہ سلسلہ برابر جاری ہے اور اِن شاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔

قرآن مجید کی تقریباً" سوا سو آیتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا ذکر آیا ہے۔ صرف اِس ایک بات

Shazia

سے بھی آپؑ کی شان اور عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس مقدس کتاب کی سورہ الصّٰفّٰت کی آیات 83 تا 111 میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور حضرت اسماعیل علیہ السّلام کے بارے میں ایسی کئی باتیں بیان کی گئی ہیں جن سے ان کی شان ظاہر ہوتی اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہر آزمائش میں پورے اُترے۔

پہلا واقعہ یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے لوگوں کو بُتوں کی پُوجا کرنے سے روکنے کے لئے ان کے بُتوں کو توڑ دیا۔ یہ کام آپؑ نے اُس وقت کیا جب وہ کوئی تہوار منانے کے لئے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ واپس آکر بتوں کو ٹوٹا ہوا دیکھا تو سمجھ گئے کہ یہ کام ضرور ابراہیم ہی نے کیا ہے' چناں چہ اُنھوں نے آپؑ کو آگ میں جلا دینے کا فیصلہ کیا۔

دوسرا واقعہ یہ بیان ہوا ہے کہ آپؑ کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السّلام جب چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تو حکم ہوا اسے ہمارے لیے قُربان کرو۔ حضرت اِبراہیم علیہ السّلام نے بیٹے سے ذِکر کیا تو وُہ خوشی خوشی قُربان ہونے کے لئے تیّار ہو گئے۔ یہ اُن دونوں کی سخت آزمائش تھی اور جب وہ اِس آزمائش میں بھی پورے اُترے تو بیٹے کی جگہ دُنبہ ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ اسی وقت سے بَقر عید کے تہوار پر اللہ کے لیے جانوروں کی قُربانی دی جاتی ہے۔ اسے سُنّتِ اِبراہیمی کہتے ہیں۔

قرآن کی آیات میں یہ واقعہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

"یقیناً یہ ایک بڑی آزمائش تھی اور ہم نے ایک بڑی قُربانی (جانور) بدلے میں دے کر بچّے کی جان بچائی اور اُس کی تعریف و توصیف ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔ سلام ہے ابراہیم پر' ہم نیکی کرنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا"۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی دو بیویوں' حضرت سارہ اور حضرت حاجرہ سے دو بیٹے تھے۔ حضرت سارہ سے حضرت اسحاق علیہ السّلام اور حضرت حاجرہ سے حضرت اسماعیل علیہ السّلام۔ حضرت اسحاق علیہ السّلام کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السّلام تھے جن کا لقب اسرائیل تھا۔ ان کی نسل میں کئی نبی پیدا ہوئے۔ انھیں انبیائے بنی اِسرائیل کہتے ہیں۔

حضرت اِسماعیل علیہ السّلام کو اللہ پاک نے یہ عزّت اور شان بخشی کہ اُن کی نسل میں سب نبیوں کے سردار اور اللہ کے آخری رَسُول حضرت مُحمّد مُصطفیٰ صَلَّی اللہ علیہ وَآلہٖ وَسَلّم پیدا ہُوئے۔ اِس کے عِلاوہ سعی' یعنی صَفا اور مَروَہ نام کی دو پہاڑیوں کے درمیان دَوڑنا' اُن کی یادگار ہیں۔ یہ مناسِک' یعنی حج کی فرض عبادتیں ہیں۔ تیسری خاص بات یہ کہ چشمہ زم زم'جس کا پانی حاجی تبرک کے طور پر لاتے ہیں' آپؑ کی برکت سے ظاہر ہوا تھا اور شہر مکّہ معظمہ بھی آپؑ ہی کی وجہ سے آباد ہوا تھا۔

جب حضرت اسماعیل علیہ السّلام پیدا ہوئے تو اللہ پاک کے حُکم سے حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اُنھیں اور اُن کی والدہ کو ایسی جگہ آباد کیا جو بِالکل وِیران تھی۔ یہ بھی دراصل آپؑ کی آزمائش تھی۔ اِس کا ذِکر بھی قُرآن مجید میں آیا ہے۔

جب وہ پانی ختم ہو گیا جو حضرت حاجرہ کے پاس تھا اور حضرت اسماعیل علیہ السّلام پیاس سے بِلکنے لگے تو وہ پانی کی تلاش میں صَفا اور مَروہ پہاڑیوں کے درمیان دوڑیں۔ کہیں پانی نظر نہ آیا' لیکن اللہ کی خاص مہربانی سے یہ معجزہ ظاہر ہوا کہ زمین پر حضرت اسماعیل علیہ السّلام کی ایڑی لگنے سے پانی کا چشمہ پھُوٹ پڑا۔ پھر یُوں ہوا کہ اس چشمے کی وجہ سے بنی جرہم نام کا ایک قبیلہ وہاں آباد ہو گیا اور شہر مکّہ کی بنیاد پڑ گئی۔ اب یہ شہر دنیا کا سب سے مقدس شہر ہے اور عظیم باپ اور عظیم بیٹے کی عظمت کی گواہی دیتا ہے۔

Sharjeel Ahmed

ماں کی کمائی

نجمہ معراج

زباد اور ثوبیہ دونوں اسکول ٹیچر تھیں۔ وہ ایک قصبے کے اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ یہ قصبہ ان کے گاؤں سے تقریباً 3 کلومیٹر دور تھا۔ ان کا اسکول قصبے کے آخری کونے پر تھا۔ اس لئے انہیں اسکول میں پہنچنے کے لئے قصبے میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ ثوبیہ اور زباد گھر سے نکلتے ہی آہستہ آواز میں باتیں کرنا شروع ہو جاتیں۔ اس طرح ان کا سفر آسانی سے گزر جاتا۔ مگر ثوبیہ جب چودھری کے گھر کے قریب سے گزرتی تو وہ سوچوں میں گم ہو جاتی۔

زباد یہ بات روزانہ نوٹ کرتی۔ ایک دو دفعہ اس نے ثوبیہ سے پوچھا بھی لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ کوئی بات نہیں، میں ایسے ہی اداس ہو جاتی ہوں۔

آج تو ثوبیہ کی آنکھیں بھی نم ناک تھیں۔ زباد آج اسکول جاتے ہوئے یہی سوچتی رہی کہ آج میں ثوبیہ سے ضرور پوچھوں گی کہ اسے یہاں پہنچ کر کون سی بات یاد آ جاتی ہے جو اسے اس قدر افسردہ کر دیتی ہے۔

دونوں اسکول کے اسٹاف روم میں داخل ہوئیں۔ اسکول لگنے میں ابھی ایک گھنٹا باقی تھا۔ ابھی کوئی اور استانی اسکول نہیں پہنچی تھی۔ باقی استانیاں عام طور پر بروقت پہنچتی تھیں مگر زباد اور ثوبیہ ہمیشہ وقت سے پہلے ہی اسکول آ جایا کرتی تھیں۔ زباد نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ثوبیہ سے کہا "میری اچھی بہن، میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ دیکھنا ٹالنا مت، مجھے آج ضرور بتا دینا"۔

"پوچھو بہنا، پوچھو۔ آپ کو نہیں بتاؤں گی تو اور کس کو بتاؤں گی بھلا" ثوبیہ نے کہا۔

"آپ کو تقریباً دو سال ہو گئے ہیں ملازمت کرتے ہوئے۔ تم روزانہ میرے ساتھ اسکول جاتی آتی ہو۔ قصبے میں صبح کو چودھری کے دروازے کے آگے سے اور شام کو ڈسپنسری کے آگے سے گزرتے ہوئے تم اس قدر افسردہ کیوں ہو جاتی ہو؟" زباد نے پوچھا۔

ثوبیہ کا دل بھر آیا۔ اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار، ٹپ ٹپ، آنسو گرنے لگے۔ "ثوبیہ یہ کیا کر رہی ہو۔ میرا مقصد آپ کو دکھ پہنچانا تو نہیں تھا۔ نہیں بتانا چاہتی تو نہ بتاؤ۔ روئیں تو نہیں۔ میں آئندہ کبھی نہیں پوچھوں گی" زباد نے کہا۔

ثوبیہ آنسو چادر کے پلو سے صاف کرتے ہوئے بولی "زباد بہن، آج تو میں آپ کو سب کچھ ضرور بتاؤں گی۔ مجھے آپ کے پوچھنے پر رونا نہیں آیا بلکہ میرے آنسو تو اس بات پر نکلے ہیں کہ جو لوگ علم پر دولت کو ترجیح دیتے ہیں انہیں کس طرح در در کی ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں۔ یہ جو چودھری کی نوکرانی ہے نا، یہ میرے چچا کی اکلوتی اولاد ہے۔ تم بھی دیکھتی ہو کہ جب ہم صبح اسکول جا رہی ہوتی

ہیں تو یہ جھاڑن سے چودھری کے گھر کا دروازہ صاف کر رہی ہوتی ہے اور جب ہم شام کو گھر جا رہی ہوتی ہیں تو یہ ڈسپنسری کے آگے جھاڑو دے رہی ہوتی ہے۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میرا دل اپنے بچپن کی یادوں میں کھو جاتا ہے"۔

زباد تو یہ سن کر حیران ہی رہ گئی اور بولی "ثوبیہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ آپ دونوں ایک ہی دادا کی پوتیاں ہو آپ لکھ پڑھ کر استانی بن گئیں اور وہ تعلیم سے محروم رہی' آخر کیوں؟"

"بہن' اس کی بھی ساری وجہ میں آپ کو آج بتا ہی دیتی ہوں"۔

یہ کہتے ہوئے ثوبیہ نے وہ واقعہ سنانا شروع کیا جس سے ثوبیہ استانی اور اس کی چچا زاد نوکرانی بنی۔ "ہمارے دادا کی ایک بچی اور دو بچے تھے۔ میرے والد سب سے بڑے اور ان سے چھوٹے اس نویدہ کے والد جو چودھری کی نوکرانی ہے۔ دادا جان کی اولاد میں سب سے چھوٹی ہماری پھوپھو جان تھیں۔ میرے اور نویدہ کے ابو ایک فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کو کام کرتے ہوئے 12 سال گزر گئے۔ وہ روزانہ شام کو گھر بس پر آتے تھے۔ ایک دن وہ گھر واپس آ رہے تھے کہ ان کی بس ٹرالے سے ٹکرا گئی۔ بہت سے لوگ اس حادثے میں جاں بحق ہوئے۔ یہ دونوں بھائی یعنی میرے والد اور نویدہ کے والد بھی اسی حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اس وقت ہم دو بہنیں تھیں۔ میں 12 سال کی اور مجھ سے چھوٹی 10 سال کی۔ میرے چچا کی بیٹی نویدہ بھی میری ہی ہم عمر تھی۔ نویدہ کی امی ان پڑھ تھی اور میری امی جان دس جماعتیں پڑھی ہوئی تھیں۔ میرے چچا جب زندہ تھے مجھے اور نویدہ کو ایک ہی اسکول میں داخل کروا کر آئے۔ جب ہم اسکول سے گھر آتے تو نویدہ کپڑے تبدیل کئے بغیر ہی گڑیا' جو اس کے ماموں نے دی تھی' لے کر باہر نکل جاتی اور شام تک اس سے کھیلتی رہتی۔ میری امی مجھے پہلے کپڑے تبدیل کرنے کو کہتیں پھر کھانا کھلاتیں۔ اس کے بعد بستا لانے کو کہتیں۔ مجھے شام تک سارا ہوم ورک اپنی نگرانی میں کرواتیں اور تختی لکھواتیں۔ مجھے اس وقت یہ سب کچھ بہت ناگوار گذرتا تھا۔ میرا دل چاہتا کہ میں بھی نویدہ کی گڑیا کے ساتھ کھیلوں لیکن جب میں امی سے کہتی تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتیں کہ ثوبیہ پہلے ہوم ورک کر لو پھر کھیل لینا۔ پھر کھیلنا خاک ہوتا تھا۔ اس وقت تک تو شام ہو چکی ہوتی تھی۔

"جب ہم دونوں کے ابو اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے تو کچھ عرصے بعد ہماری مالی حالت کافی خراب ہو گئی۔ نویدہ کی امی نے نویدہ کو تیسری جماعت میں فیل ہونے پر اسکول سے اٹھوا لیا۔ اس کی امی چوں کہ ان پڑھ تھیں اس لیے انہیں کوئی بھلے کی بات بھی کہتا تو وہ لڑ پڑتیں۔ ہر کسی سے بات بے بات لڑنا گویا ان کی عادت بن چکی تھی۔ وہ میری امی' دادی جان اور پھوپھو جی سے اکثر لڑتی رہتی تھیں۔ لہٰذا دادی نے نویدہ کی امی جان کی اس عادت کو دیکھتے ہوئے سوچا کہ میں اپنی زندگی میں ہی ان دونوں بہوؤں کو علیحدہ کر دوں تو اچھا ہے۔ سردیوں کی ایک شام دادی جان نے سب کو اکٹھا کیا اور کہا "جتنا وقت اکٹھے رہتے گذر گیا وہ بہت اچھا گزر گیا۔ اب اکٹھے رہنا مشکل نظر آتا ہے۔ ہم گھر کے دو حصے کر لیتے ہیں۔ آئندہ نویدہ کی امی اور زباد کی امی دونوں علیحدہ علیحدہ رہا کریں گی۔ باقی رہ گئیں ہم دونوں' آپ کی ساس اور آپ کی یہ نند جو اب اپنی باقی زندگی ہمارے ہی پاس گزارے گی----" دادی جان کی بات ابھی مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ نویدہ کی امی تیز آواز میں بولیں "میں تو اس اندھی لڑکی اور بوڑھی اماں کو ساتھ نہیں رکھ سکتی۔ میں تو اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ پتا نہیں کن مصیبتوں سے پالوں گی"۔

اس سے پہلے کہ دادی اماں یا پھپھو جان اپنے بارے میں کوئی فیصلہ خود کرتیں میری امی نے دادی اماں اور پھپھو جان کو انتہائی خوش دلی سے اپنے ساتھ رہنے

کے لئے کہا۔ اب ہماری پھوپھو جان' ہم دونوں بہنیں اور ہماری دادی اماں اور میری پیاری امی جان ایک گھر میں رہنے لگیں۔ جب کہ دوسرے گھر میں نویدہ اور اس کی امی۔ میری امی تو گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں اور دادی اماں کی کمر اپنے دو جوان بیٹوں کے صدمے سے دہری ہو گئی تھی۔ اپنی اکلوتی بیٹی کا صدمہ بھی اندر ہی اندر انہیں گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا جس کی شادی انہوں نے اپنے بیٹوں کی وفات کے تقریباً" دو سال بعد کی تھی۔ قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ شادی کو ابھی پندرہ روز ہی گزرے تھے کہ اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا۔ ایک دن وہ اپنے سسرال کے گھر میں چنے پکا رہی تھی کہ اس نے جلدی میں پریشر ککر کھولا تو کھولتا ہوا سالن اچھل کر اس کے چہرے پر پڑ گیا۔ سسرال والے اسے جلدی سے قریبی ہسپتال میں لے گئے۔ اسے انتہائی نگہ داشت کے کمرے میں رکھا گیا۔ سسرال والے اچھے کھاتے پیتے تھے۔ اس لیے انہوں نے سوچا کہ کوئی بات نہیں اگر چہرہ متاثر ہو گیا تو پلاسٹک سرجری کروا لیں گے مگر قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ان کی بہو کا صرف چہرہ ہی متاثر نہیں ہوا تھا بلکہ ایک ڈاکٹر نے باہر آ کر بتایا کہ اس کی دونوں آنکھوں کی بینائی بھی جاتی رہی ہے۔ "کیا یہ اپریشن سے واپس آ سکتی ہے؟" سسرال والوں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"جی نہیں" ڈاکٹر نے انتہائی مایوسی کے ساتھ بتایا۔ یہ سن کر اس کے میاں نے اندھی بیوی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

"اب پھوپھو جان بھی اس وقت سے ہمارے گھر کا ایک فرد تھیں۔ میں اس وقت ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ اب میری پڑھائی کے اخراجات برداشت کرنا ہمارے گھر والوں کے لئے بہت مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے اسکول چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر میری امی جی' پھوپھو جان اور دادی اماں مجھے ہر صورت تعلیم دلوانا چاہتی تھیں۔ دادی اماں کہنے لگیں "بیٹی آپ ضرور اسکول جایا کرو جیسے بھی ہوگا ہم آپ کی تعلیم کے اخراجات پورے کریں گے"۔

اس دن کے بعد دادی اماں اپنے ہاتھ سے میدے کی سویاں بنانے لگیں۔ ہمارے گھر کے سامنے تھوڑی سی جگہ خالی پڑی تھی جہاں سکھ چین کا درخت تھا۔ اس کی بڑی گھنی چھاؤں ہوتی تھی۔ دادی اماں وہاں بیٹھ کر سویاں بناتی رہتیں۔ گاؤں کی بہت سی عورتیں بھی اپنے چھوٹے موٹے کام لے کر وہاں آ جاتیں۔ کسی نے سبزی پکڑی

ہوتی تو کوئی لسن چھیل رہی ہوتی اور کوئی سوئیٹر بن رہی ہوتی۔ سارا دن کافی رونق رہتی۔ پاس ہی ایک کنواں تھا۔ وہاں سے بھی سارا دن لوگ پانی بھرتے رہتے اور کچھ لڑکیاں وہاں کپڑے دھونے کے لئے بھی آ جاتیں۔ دادی اماں مزے مزے کی باتیں کرتی رہتیں اور ساتھ ساتھ ہاتھوں سے چاول کے دانے کے برابر بلوں والی سویاں بناتی رہتیں جن میں انہوں نے کھانے کے مختلف رنگ بھی ڈالے ہوتے تھے۔

اماں کی سویاں عید، بکر عید اور شب برات پر ہاتھوں ہاتھ بک جاتیں۔ کسی کے ہاں بچے کی پیدائش ہوتی تو دایہ کہتی کہ زچہ کو سب سے پہلے ہاتھ کی بنی ہوئی سویاں تھوڑا سا گھی اور چینی ڈال کر کھلاؤ۔ اب تو اس گاؤں میں بچے کی پیدائش پر زچہ کو سویاں کھلانا گویا لازمی قرار دیا جا چکا تھا۔ اس طرح اماں کی سویاں کبھی بھی بکنے سے نہ رہتی تھیں۔

پھوپھو جان نے بھی پھولوں کے ہار بنانے شروع کر دیئے تھے۔ جنہیں ایک آدمی اسی قصبے میں بیچ آتا تھا جس میں آج میں اور آپ پڑھا رہی ہیں۔ یوں ہمارے گھر کے اخراجات پورے ہونے لگے تھے۔ میری امی جان دادی اماں اور پھوپھو جی کی محنت سے حاصل کی گئی اس کمائی کو بڑی سمجھ داری کے ساتھ استعمال کرتیں۔ وہ سارا ہفتہ دھونے والے کپڑے اکٹھے کرتی رہتیں۔ جمعے کے دن مجھے اور میری بہن، دونوں کو اسکول سے چھٹی ہوتی تھی۔ امی جان نے مٹی کی ایک پرات (جسے ہم اپنی زبان میں "کنالی" کہتے ہیں) میں صابن بنایا ہوتا تھا۔ یہ صابن امی جان خود گھر میں تیار کرتی تھیں۔ کیوں کہ بازار کا صابن بہت مہنگا پڑتا ہے۔ ہماری امی چھٹی کے دن دھونے والے سارے کپڑوں کو گیلا کر کے صابن والی اس پرات پر پھیر کر صابن لگا دیتیں۔ امی جان کو ایسا اس لیے کرنا پڑتا تھا کہ وہ مٹی کی یہ پرات ہمیں ساتھ نہیں دینا چاہتی تھیں اس لیے کہ ہم زیادہ صابن ضائع نہ کریں۔ دوسرا یہ کہ کہیں پرات ٹوٹ نہ جائے۔ کپڑوں کی دو بالٹیاں بھر جاتیں۔ ہم دونوں بہنیں اٹھا کر قریب ہی کنویں پر جا کر دھو لاتیں۔ اس طرح ہمارا وقت گزرتا رہا"۔

اب مجھے استانی لگے ہوئے دو سال ہو گئے ہیں اور میری چھوٹی بہن دسویں میں پڑھ رہی ہے۔ اب ہماری کافی اچھی گذر اوقات ہو جاتی ہے۔ کچھ تو میری تنخواہ کے پیسے ہوتے ہیں اور کچھ میں اور میری بہن بچیوں کو ٹیوشن پڑھا لیتی ہیں۔ لیکن جب میں نویدہ کو چودھری کے گھر یا ڈسپنسری میں جھاڑو دیتے ہوئے دیکھتی ہوں تو میرا دل بہت کڑتا ہے۔ اگر یہ بھی پڑھ لیتی تو اب اسے یہ کام نہ کرنے پڑتے۔ کاش نویدہ کو تعلیم کی کچھ قدر معلوم ہوتی۔

امی جان بتا رہی تھیں کہ چند دن پہلے چودھری کا پوتا فوت ہو گیا تھا۔ میں بھی افسوس کے لیے وہاں گئی تو نویدہ سے میری ملاقات ہوئی۔ نویدہ نے مجھ سے کہا کہ تائی جی میں اس وقت سارا سارا دن گڑیوں سے نہ کھیلتی تو آج میں بھی استانی ہوتی۔ اب میں جیسے بھی ہوا محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کو ان شاء اللہ ضرور تعلیم دلواؤں گی۔ مجھے تو اب پتا چلا کہ علم اتنا بڑا خزانہ ہے۔ جو انسان کو معاشرے میں بہت اچھا مقام دلواتا ہے۔

ادھر ثوبیہ نے یہ دکھ بھری کہانی ختم کی ادھر اسکول کے چپڑاسی نے گھنٹی بجا دی۔ زباد اور ثوبیہ دونوں اسٹاف روم سے نکل کر اسمبلی گراؤنڈ کی طرف چل پڑیں۔ وہ دونوں گفت گو میں اس قدر مگن ہو گئی تھیں کہ انہیں یہ علم ہی نہ ہوا کہ اسکول کی دوسری استانیاں بھی اسکول پہنچ چکی ہیں اور ان کی کہانی سن رہی ہیں۔ وہ جب اسمبلی گراؤنڈ کی طرف جا رہی تھیں تو پیچھے دوسری استانیاں یہ باتیں کرتی ہوئی آ رہی تھیں۔ "علم واقعی مال و زر سے کہیں بڑی دولت ہے" ایک نے کہا۔

ایک دوسری استانی بولی "بچیوں کو گڑیوں سے ضرور کھیلنا چاہیے مگر اتنا بھی نہیں کہ ان کے مستقبل کو ہی تباہ کر دیں اور پھر انہیں استانی کی بجائے نوکرانی بننا پڑے"۔

پائلٹ کا وعدہ

سلیم خان گمی

یہ 1965ء کی بات ہے۔ بڑی عید بہت دور تھی۔ کسی کے وہم و خیال میں بھی نہیں تھا کہ قربانی کے جانور مہنگے ہو جائیں گے کیوں کہ 1965ء میں مہنگائی بھی زیادہ نہیں تھی۔ لیکن وقار اپنے سر میں سوچنے والا ذہن رکھتا تھا۔ وہ پاک فضائیہ میں شروع شروع میں تو جنرل ڈیوٹی پائلٹ تھا لیکن بعد میں اس نے بم بار جہاز اڑانے کی تربیت حاصل کی۔

ایک دن وقار کی والدہ، بلقیس بیگم صحن کے ایک کونے میں بنے ہوئے باورچی خانے میں چاول پکا رہی تھیں کہ ننھی طاہرہ بھاگی بھاگی آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔ جو ڈاکیا ابھی ابھی دے کر گیا تھا۔ باورچی خانے میں آکر وہ خوشی سے بولی "امی جان، یہ دیکھو بھائی جان کا خط۔ ابھی ابھی ڈاکیا لایا ہے۔ آپ کے چاولوں کی طرح گرما گرم ہے"۔

بلقیس بیگم کے چہرے پر خوشی ناچ اٹھی۔ وہ بولی "طاہرہ بیٹی، جلدی سے پڑھو کیا لکھا ہے میرے بیٹے نے"۔

"امی، لکھا ہے کہ۔ چلیں میں آپ کو خاص خاص سناتی ہوں۔ آپ کو سلام اور مجھے پیار کے بعد بھائی لکھتے ہیں کہ وہ اتوار کو گھر آ رہے ہیں۔ ایک مہینے کی چھٹی پر"۔

"اور کیا لکھا ہے بیٹی وقار نے؟" بلقیس بیگم نے پوچھا

"اور لکھا ہے کہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ روزانہ پانچ وقت نماز پڑھتا ہوں۔ اس کے بعد دوڑ لگاتا ہوں۔ پھر ڈرل ہوتی ہے اور اس کے بعد دوپہر تک جہاز کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ ہفتہ میں تین بار جہاز بھی اڑاتا ہوں۔ اڑتے ہوئے جہاز سے پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ بھی لگاتا ہوں"۔

"اللہ تعالیٰ میرے بیٹے کی حفاظت فرمائے"۔

اتوار آیا تو وقار بھی آ گیا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کی ماں نے اس کا منہ ماتھا چوما اور ڈھیروں دعائیں دیں۔ طاہرہ کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھل گیا۔ وقار نے اپنی ننھی بہن کے خوب صورت ہاتھ آنکھوں پر لگائے اور اپنے دونوں ہاتھ پیار سے سر پر پھیرے۔ گھر سے باہر ان کا نوکر امانت کھڑا تھا اور اڑوس پڑوس کے بہت سے لوگ اسے ملنے آئے ہوئے تھے۔

وقار نے رات اپنی امی سے کہا کہ ابھی سے عید قربان کے لئے دو بکرے خرید لیے جائیں تاکہ عید تک خوب پل جائیں اور بڑے ہو جائیں۔ بلقیس بیگم کو وقار کی یہ بات بہت پسند آئی۔

دوسرے دن صبح بلقیس بیگم نے وقار کو ایک ہزار روپے دیئے کہ وہ دو بکرے خرید لائے۔ وقار نے امانت کو ساتھ لیا اور بکرے خریدنے کے لئے بکر منڈی چلے گئے۔ تین گھنٹوں کے بعد واپس لوٹے تو کالے بکرے کی رسی امانت کے ہاتھ میں تھی اور بھورے رنگ کے بکرے کی وقار کے ہاتھ میں۔

وقار کو اپنی ماں اور بہن کے پاس آئے ہوئے ابھی سات دن ہوئے تھے کہ اسے ایئر ہیڈ کوارٹر سرگودھا سے حکم ملا کہ وہ اپنی چھٹی منسوخ سمجھے اور ڈیوٹی پر حاضر ہو۔ یہ حکم اس لئے دیا گیا تھا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان لڑائی کا خطرہ تھا۔ اطلاع پا کر طاہرہ تو بے حد اداس ہو گئی۔ اسے دکھ تھا کہ وہ اپنے بھائی سے پھر جدا ہو رہی تھی البتہ بلقیس بیگم کا چہرہ پر سکون تھا۔

وقار سرگودھا کے لئے روانہ ہو گیا۔ سرگودھا پہنچ کر اس نے محسوس کیا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے جس کے لئے اس نے دن رات کی محنت سے بم بار طیارہ اڑانے کی تربیت حاصل کی ہے۔ ایک ولولہ، ایک جذبہ اور ایک عزم اس کے سینے میں مچل اٹھا۔

وہ اور اس کے ساتھی فضا میں اڑنے کے لئے بے تاب تھے۔ ان کے چہرے شجاعت اور بہادری سے دہک اٹھے تھے۔ وہ اپنے پیارے وطن کے ذرے ذرے کی حفاظت کے لئے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کی خاطر سر ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے۔ اگلے دن اسے اس کے ایئر کموڈور نے بلوایا۔

وقار جب بریفنگ روم میں پہنچا تو تین افسر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ان تین افسروں کی کمیٹی کے چیئرمین ایئر کموڈور نے کہا "وقار بیٹھو اور غور سے ہماری بات سنو"۔

"یس سر" وقار نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہماری اطلاع کے مطابق بھارت کے ضلع گور داس پور میں بٹالہ کے مقام پر ہوائی جہازوں کا نیا اڈا بن گیا ہے اور وہاں بھارتی فضائیہ کے 15 بم بار طیارے آ چکے ہیں جو جدید ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق ان کے پائلٹ تربیت یافتہ اور چست و چالاک ہیں۔ جہازوں کے لئے فیول یعنی ایندھن کافی مقدار میں اسٹور کیا گیا ہے۔ جہازوں کی دیکھ بھال کرنے والا گراؤنڈ اسٹاف بھی اعلیٰ تربیت یافتہ ہے۔ ان جہازوں کو چھپانے (کیمو فلاج کرنے) کے لئے بہت اچھا انتظام کیا گیا ہے۔ سکیوریٹی ایسی ہے کہ پرندہ پر نہ مار سکے۔ اس ہوائی اڈے کی اطلاع پاکستان کے دوست ملک چین نے دی ہے اور چینی اطلاع کی تصدیق امریکا نے کی ہے۔ یہ اطلاع انتہائی خفیہ ہے۔ پاک فضائیہ کے چند افسروں کو ہی بٹالہ کے ہوائی اڈے کا علم ہے۔ اب ان چند افسروں میں ایک آپ بھی ہیں۔ آپ کو یہ اطلاع اس لئے دی گئی ہے کہ آپ اس اڈے کو تباہ کر سکیں"۔

"یس سر، تھینک یو"۔

"میں جانتا ہوں۔ مرزا اور خان آپ کو تفصیلات بتائیں گے"۔

"یس سر" وقار کھڑا ہو گیا۔ ایئر کموڈور بریفنگ روم چھوڑ کر باہر نکل گیا اور وقار اپنے دو افسروں کے پاس مزید ہدایات لینے کے لئے بیٹھ گیا۔ مرزا نے اپنے بریف کیس سے بھارت کا نقشہ نکالا اور میز پر پھیلا دیا۔ پھر وہ تینوں وقار کی اس مہم کی تفصیلات پر بحث کرنے لگا۔

بھارت طے کر چکا تھا کہ پاکستان پر 6 ستمبر کو چوری چھپے حملہ کرے گا۔ وہ بحر ہند کے ساتھ ساتھ اپنے صوبے گجرات کاٹھیاواڑ کے ریتلے حصے کرن کچھ میں پاکستان کی بہادر فوجوں سے بری طرح مات کھا چکا تھا اور اب کشمیر کا بہانہ بنا کر پاکستان پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ چناں چہ اس نے 6 ستمبر کو پنجاب کی مشرقی سرحد پر چپکے سے یلغار کر دی اور مشرقی محاذ پر ضلع نارووال کی تحصیل شکر گڑھ سے لے کر چولستان تک میدان گرم ہو گیا۔ پیدل فوجیں، کمانڈو، بکتر بند دستے، ٹینک اور بم بار طیارے حرکت میں آ گئے۔ لیکن وقار کی مہم تو اس لڑائی کا پہلا عملی اظہار تھا جو بھارت

کی نہایت خطرناک جنگی چال کی تباہ کاریوں کو روکنے کے لئے وجود میں آیا تھا۔ ابھی 6 ستمبر سے دو دن پہلے پاک فوج کو اطلاع مل چکی تھی کہ بٹالہ سے بھارتی فضائیہ کے 15 بم بار طیارے صبح سویرے سرگودھا کے ہوائی اڈے پر حملہ کریں گے اور پاک فضائیہ کے زمین پر کھڑے ہوائی جہازوں کو نشانہ بنائیں گے۔

وقار کو حکم ملا کہ وہ 4 ستمبر کی رات کو بٹالہ کے ہوائی اڈے کو بم بار طیاروں سمیت تباہ کر دے۔ چناں چہ وقار اپنے بم بار طیارے میں بٹالہ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے ہوائی اڈے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کچھ بم بار طیاروں کو بھی نشانہ بنایا اور تباہ کیا اور کچھ کو ناکارہ کر دیا۔ لیکن جب وہ واپس ہوا تو اس کا اپنا جہاز ہٹ ہو گیا اور وقار نہایت مشکل سے پیرا شوٹ کے ذریعے نیچے کود گیا۔ وہ گوبند پورہ نام کے ایک گاؤں کے کھیت میں گرا۔ اس کھیت میں کماد کی فصل تھی۔ کماد انسانی قد سے اونچا تھا۔ اس لیے اسے کوئی نہ دیکھ سکا۔ اس کے علاوہ رات کا وقت تھا اور رات کا بھی آخری پہر، جب سبھی لوگ میٹھی نیند سوئے ہوتے ہیں۔

جب سورج نکلا تو وقار گڑھا کھود کر اپنا پیرا شوٹ اس میں دفن کر چکا تھا۔ اب اس کے پاس پستول اور خنجر تھا اور وہ پاک فضائیہ کی وردی میں تھا جسے آسانی سے پہچانا جا سکتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وردی میں اس کی سکیوریٹی بہت کم زور ہے۔ چناں چہ اس نے کماد کے کھیت میں گھومنا شروع کیا کہ شاید اسے کوئی چادر یا کمبل مل جائے۔ اسے نہ چادر ملی نہ ہی کمبل البتہ ایک رہٹ ملا جو خاموش تھا۔ ساتھ ہی ایک درخت کے ساتھ بیل بندھا تھا۔ بیل کے سامنے دری بچھی تھی جو میلی کچیلی اور بوسیدہ تھی۔ اس پر چارہ پڑا تھا جو بیل کھا رہا تھا۔ وہاں نہ کوئی انسان تھا اور نہ ہی پرندہ۔ اس نے رہٹ پر کھڑے ہو کر نظر دوڑائی۔ دور افق کے پاس ہریاول دکھائی دی۔ غور سے دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ کیکروں اور بیریوں کا جنگل ہے۔ وہ اس طرف چل دیا۔ اس نے وہی میلی کچیلی دری اپنے اوپر لے کر وردی کو چھپایا ہوا تھا۔

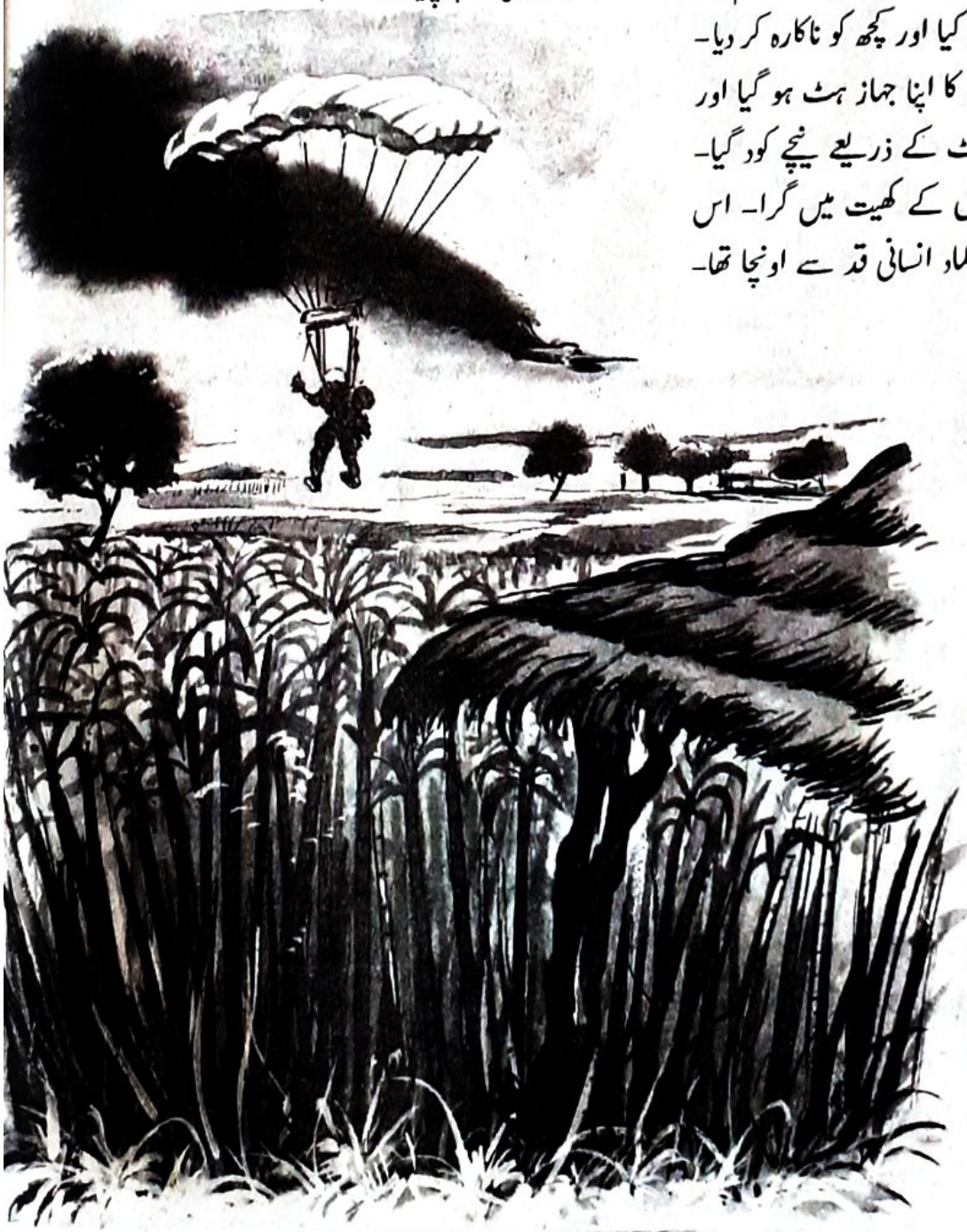

Shazia

جب وہ جنگل میں پہنچا تو سورج کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ اور چرواہے بھیڑ بکریاں لے کر جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ اس نے جگہ جگہ بھیڑوں اور بکریوں کی مینگنیاں دیکھیں جو سوکھ چکی تھیں۔ اس نے سوچا کہ بھیڑیں اور بکریاں اس جنگل میں صبح سے شام تک رہتی ہیں اس لیے ان کو پیاس بھی لگتی ہو گی۔ یقیناً اس جنگل میں پانی کا انتظام بھی ہو گا۔ چناں چہ وہ دری اوپر لئے پانی کی تلاش میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ اسے بہت جلدی تھی کیوں کہ کسی وقت بھی چرواہوں کی نظر اس پر پڑ سکتی تھی۔ اس کے جہاز کی تباہی کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ سارے علاقے میں پتا چل گیا تھا کہ پاکستانی جہاز گر کر تباہ ہو چکا ہے اور اس کا پائلٹ جان بچانے میں کام یاب ہو چکا ہے۔

اس نے ایک جگہ دیکھی جہاں بہت سے گنے اگے ہوئے تھے۔ وہ حیران ہوا کہ یہاں گنے کہاں سے آ گئے؟ یہ تو بیریوں اور کیکروں کا جنگل ہے اور یہاں پر پانی بھی نہیں ہے۔ گنے تو وہاں اگتے ہیں جہاں پانی وافر مقدار میں ہو۔ وہ گنوں کی طرف بڑھا۔ اس نے آگے بڑھ کر گنوں کے جھنڈ میں نگاہ ڈالی تو اسے چھوٹی اینٹ کا کنواں نظر آیا۔ چھوٹی اینٹوں سے اس نے اندازہ لگایا کہ یہ کنواں مغلیہ دور میں تعمیر ہوا ہو گا۔ کنویں کی منڈیر پر نہ کوئی رسا تھا نہ رسی۔

وہ حیران کھڑا تھا کہ پیچھے سے بھیڑوں اور بکریوں کے ممیانے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ دو چرواہے ان کو ہانک کر کنویں کی طرف لا رہے تھے۔ وہ گنوں کے جھنڈ میں سے ہو کر کنویں کی منڈیر پر آ گیا۔ اور یوں خود کو چرواہوں کی نظر سے بچانے میں کام یاب ہو گیا۔ بھیڑوں بکریوں کے ممیانے کی آوازیں اب قریب آ رہی تھیں اور دونوں چرواہے بھی باتیں کر رہے تھے۔

"بشن سنگھ' ہوائی جہاز پاکستان کا بتایا جاتا ہے"۔

"نہیں رام چند' یہ ہوائی جہاز ہمارا ہی ہے۔ سنا ہے بٹالے میں نیا اڈا بنا ہے اور وہاں سکھلائی کی جاتی ہے۔ سکھلائی کرتے ہوئے جہاز گرا اور تباہ ہو گیا"۔

"اگر یہ بات ہوتی تو سیکھنے والے اور سکھلانے والے کی لاشیں مل جاتیں۔ لاش تو ایک بھی نہ ملی"۔

"چھوڑو ان باتوں کو۔ شام کو گاؤں جائیں گے تو نمبردار سے پتا چل جائے گا کہ کس کا جہاز تھا۔ پاکستان کا یا بھارت کا"۔

اب وہ دونوں چرواہے اپنی بھیڑوں اور بکریوں کو ہانکتے چلے آ رہے تھے۔ وقار پھر منڈیر سے ہٹ کر گنوں میں چھپ گیا۔

دونوں چرواہے منڈیر پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک کے ہاتھ میں بالٹی تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں رسا۔ جس چرواہے کے ہاتھ میں رسا تھا اس نے دوسرے سے بالٹی لی۔ بالٹی کے ساتھ رسا باندھا اور پانی نکالنے کے لئے بالٹی کو کنویں میں ڈال دیا۔ بالٹی پانی کی سطح پر گری تو ایک بے معنی آواز اوپر آئی۔ گویا پانی بالٹی میں داخل ہو رہا ہے۔ وہ دونوں رسا پکڑ کر بالٹی نکالنے لگے۔ وقار نے منڈیر پر آ کر بجلی کی تیزی سے خنجر سے پہلے ایک چرواہے کے پیٹ کو نشانہ بنایا۔ خون کا فوارہ پھوٹا اور چلائے بغیر غڑاپ کنویں میں گر گیا۔ دوسرے نے رسا چھوڑ کر وقار پر حملہ کر دیا۔ لیکن وقار زیادہ پھرتیلا نکلا۔ اس نے خنجر سے اس کی گردن کاٹ دی۔

وقار نے دری اور اپنی وردی کنویں میں پھینک دی اور چرواہے کی شلوار قمیص اور پگڑی پہن لی۔ لیکن قمیص پہننے سے پہلے ان جگہوں پر کیچڑ مل دیا جو خون آلود تھیں۔ پھر چرواہے کا سر اور دھڑ کنویں میں پھینک دیا۔

کنویں کے جنڈ سے نکل کر اس نے جنگل میں چرتی ہوئی بکری کا کان ایک ہاتھ سے پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے بکری کا تھن پکڑ کر دودھ پینے لگا۔

یہ دودھیلی بکری تھی۔ اس نے سیر ہو کر دودھ پیا پھر وہ جنگل سے نکلا اور یونہی اندازے سے کھیتوں میں

سے ہوتا ہوا نارووال کی طرف چل دیا۔ اسے کھیتوں میں گھومتے پھرتے کئی سکھ کسان ملے لیکن اسے کوئی نہ پہچان سکا کہ وہ پاک فضائیہ کا ہوا باز ہے۔

سارا دن سفر کرنے کے بعد وہ شام کو ایک گاؤں میں پہنچا اور ایک بوڑھے سکھ سے اس گاؤں کا نام پوچھا۔ بوڑھا سکھ بولا "اس گاؤں کا نام نانک پورہ ہے۔ اور تم شاید بی بی من جیت کور کو یہ بتانے آئے ہو کہ اس کا بیٹا رنجیت سنگھ مل گیا ہے۔ یہی بات ہے نا"۔

"ہاں چاچا' یہی بات ہے۔ لیکن مجھے بی بی جی کے گھر کا پتا نہیں ہے وہ بتا دو"۔

"آؤ میرے ساتھ۔ میں آپ کو بی بی من جیت کور کے گھر لئے چلتا ہوں"۔

وہ شخص وقار کو ایک تنگ گلی کے بڑے مکان میں لے گیا۔ اور من جیت کور کے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا۔ دروازہ کھلا تھا اور صحن میں ایک 20 سال کی لڑکی کھڑی تھی۔ وہ وقار کو دیکھ کر دروازے پر آئی اور بولی "کون ہے تو؟"

"پہلے اپنا نام بتاؤ آپ کون ہیں؟"

"میں من جیت کور کی بیٹی اور رنجیت سنگھ کی بہن دل جیت کور ہوں' اپنا نام بتاؤ"۔

"میرا نام ہرنام سنگھ ہے اور میں یہ بتانے آیا ہوں کہ تیرا بھائی رنجیت سنگھ زندہ ہے" وقار نے کہا۔

"ہرنام سنگھ اندر آ جاؤ اور یہ خبر ماں کو سناؤ۔ وہ بہت فکر مند ہے۔ وہ پچھلے دو دن سے رو رہی ہے"۔

وقار یعنی ہرنام سنگھ اندر گیا۔ من جیت کور اس کی بات سن چکی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر پیار دیا اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دل جیت کور جلدی سے پیتل کے گلاس میں دودھ لے آئی۔ وقار نے دودھ پیا اور بولا "ماں میں نے آج سارا دن سفر کیا ہے اور تھک چکا ہوں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں"۔ من جیت کور اسے اندر لے گئی اور ایک پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اس پر لیٹ گیا۔ من جیت کور نے پنکھا چلایا اور باہر باورچی خانے میں آ کر کھانا تیار کرنے لگی۔

6 گھنٹے سونے کے بعد جب آدھی رات کو اس کی آنکھ کھلی تو من جیت کور کھانا لئے بیٹھی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ دیر تک سوتا رہا ہے لیکن وہ بہت تھک چکا تھا کیوں کہ اس نے سارا دن پیدل سفر کیا تھا اور بیس گھنٹوں سے کچھ نہ کھایا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے رنجیت سنگھ کے متعلق پوچھا۔ من جیت کور نے اسے بتایا کہ اس کی بیٹی دل جیت کور کی منگنی ایک فوجی کیپٹن کرپال سنگھ سے ہو چکی ہے اور اب دونوں کی شادی ہونے والی تھی کہ پاکستان اور بھارت کا جھگڑا بڑھ گیا۔ دونوں ملکوں کی فوجیں سرحدوں پر آ گئیں۔ اور کیپٹن کرپال سنگھ کی ڈیوٹی نارووال کے سامنے بھارتی مورچوں میں لگ گئی ہے۔ میرا بیٹا رنجیت سنگھ جس کی عمر 10 سال ہے اپنے جیجا جی (بہنوئی) سے ملنے گیا تھا کہ گم ہو گیا۔ پتا چلا ہے کہ وہ کشتی میں بیٹھ کر کھیل رہا تھا کہ کشتی کا درخت سے بندھا ہوا رسا ٹوٹا اور پانی کی لہر کشتی کو رنجیت سنگھ سمیت دوسرے کنارے پر لے گئی۔ یہ دوسرا کنارہ پاکستان میں ہے۔

من جیت کور یہ کہ کر رونے لگی۔ وقار نے اسے تسلی دی اور بولا "میں آج رات رنجیت سنگھ کو تلاش کرنے کے لئے روانہ ہو جاؤں گا اور کل کیپٹن کرپال سنگھ سے مل کر اس کا کھوج لگاؤں گا۔ مجھے امید ہے کہ رنجیت سنگھ دو ایک دن میں آپ کو مل جائے گا"۔

وہ جب من جیت کور اور دل جیت سنگھ سے اجازت لے کر آدھی رات کے بعد ان کے گھر سے باہر نکلا تو وہی بوڑھا سکھ اسے چند گز کے فاصلے پر کھڑا نظر آیا۔ وقار جو سکھ نوجوان پرنام سنگھ بنا ہوا تھا' کھیتوں میں سے گزرتا ہوا پگ ڈنڈی پر آ گیا۔ بوڑھا سکھ اس کے پیچھے ہو لیا۔ جب وقار سڑک پر آیا تو وہاں ایک جیپ کھڑی تھی۔

"یہی ہے" بوڑھا سکھ بولا۔ اس کی آواز سن کر ایک فوجی افسر اور دو فوجی لپک کر آگے بڑھے اور اس پر ٹوٹ پڑے۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا لیکن اس کے سامنے بھارتی فوج کا افسر تھا اور دائیں بائیں دو فوجی جوان تھے۔ پیچھے بوڑھا سکھ تھا اور آگے من جیت کور کا گاؤں۔ وہ بھاگ کر واپس اس لئے نہیں جا سکتا تھا کہ اس سے من جیت کور اور رنجیت کور پر کوئی مصیبت آ سکتی تھی۔ اور پھر بھارتی فوجی اس پر گولی بھی چلا سکتے تھے۔

وہ تینوں اسے قابو کرنا چاہتے تھے کیوں کہ ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ سکھ نہیں بلکہ مسلمان ہے۔ وہ اسے زبردستی جیپ کی طرف لے جا رہے تھے مگر وقار شدید مزاحمت کر رہا تھا۔ وہ خالی ہاتھوں سے مقابلہ کرتا رہا اور لہولہان ہوتا رہا۔ آخر اسے یاد آیا کہ اس کے پاس خنجر بھی ہے جو اس نے نیفے میں اڑسا ہوا ہے۔ اس نے جھک کر خنجر نکالا اور بھارتی فوج کے کپتان کے دل کے آرپار کر دیا۔ وہ ہائے رام کہ کر دہرا ہوا اور نیچے گر پڑا۔

کپتان کی موت پر دونوں نے وقار کو چھوڑ دیا۔ ایک جیپ کے طرف بھاگا دوسرا اپنی رائفل سے فائر کرنے لگا لیکن اسے ٹرائیگر دبانے کا موقعہ نہ مل سکا اور وقار کے خنجر کا شکار ہو گیا۔ بوڑھا سکھ کرپان لئے ہوئے بڑھا تو خنجر کے ایک وار سے اس کی شہ رگ کٹ کر لٹکنے لگی اور وہ "ہے واہ گرو جی" کہ کر دم توڑ گیا۔

اب ڈرائیور زندہ تھا اور جیپ میں گھس کر اسے چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ زخمی وقار نے اس پر حملہ کیا اور اسے جیپ سے باہر نکال کر خنجروں کے پے درپے وار کر کے ٹھنڈا کر دیا پھر جیپ میں بیٹھا اور نارووال کی طرف دریائے راوی کا رخ کیا۔

وقار نے جیپ کی نہ سامنے کی بتیاں جلائیں نہ ہی پیچھے کی۔ وہ چاندنی میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ پچھلے پہر کا چاند نکل آیا تھا' ہر سو چپ کا راج تھا۔ کبھی کبھی گیدڑوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ جب سڑک ختم ہوئی تو اس نے جیپ بڑ کے درخت کے پیچھے کھڑی کی اور پیدل چل پڑا۔

اگلے دن سورج نکلنے سے پہلے زخمی وقار نارو وال کے سامنے کپڑوں سمیت دریائے راوی میں اترا اور تیرتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ ڈیوٹی پر موجود فوجی جوانوں نے اسے جاسوس سمجھ کر پکڑا اور کمانڈو میجر فیصل خان کے پاس لے آئے۔

میجر فیصل خان کو اطلاع مل چکی تھی کہ پائلٹ وقار کا بم بار طیارہ بھارت میں تباہ ہو چکا ہے اور وہ لاپتا ہے۔ یعنی یہ معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہے یا شہید ہو چکا ہے۔ جب وقار نے میجر فیصل خان کو اپنی شناخت کرائی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ پھر وہ اس کے لئے کپڑوں' کھانے اور آرام کا بندوست کرنے لگا۔ وقار بولا "یہ سب کچھ ہو جائے گا اب تو میں اپنوں میں ہوں۔ البتہ میں نے بھارت میں ایک ماں سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کے بیٹے رنجیت سنگھ کو تلاش کر کے بھارت بھجواؤں گا"۔

"آپ کا وعدہ پورا ہوگا' رنجیت سنگھ ہمارے پاس ہے۔ وہ تین دن پہلے ہمیں کشتی میں بیٹھا ملا تھا۔ یہ کہ کر میجر نے رنجیت سنگھ کو بلوایا۔ وقار نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر میجر کی طرف دیکھا۔

"اسے ابھی کیپٹن کرپال سنگھ کے پاس بھجوا دیتے ہیں"۔

3 ستمبر کو شام رنجیت سنگھ اپنی ماں کے پاس پہنچ گیا اور دوسرے دن بھارت نے لاہور پر حملہ کر دیا۔ لیکن ناکام رہا۔ لڑائی ختم ہو گئی۔ وقار کو اپنے مشن کی کام یابی پر انعام بھی ملا اور اس کی ترقی بھی ہوگئی۔ عیدالاضحیٰ سے پہلے اس کے انعام اور ترقی کی خبر خط کے ذریعے اس کے گھر پہنچی تو سارے گاؤں والوں نے جشن منایا۔ پھر وہ عید الاضحیٰ پر ایک ماہ کی چھٹی لے کر گھر آیا تو نا صرف بلقیس بیگم' طاہرہ اور امانت اس کے منتظر تھے بلکہ سارے علاقے کے لوگ اسے ملنے کے لئے آئے۔ لوگوں نے پھولوں کے ہاروں سے اسے لاد دیا۔ اگلے دن عید تھی۔ وقار نے دونوں بکروں کی قربانی دی اور گاؤں بھر کے بچوں اور بڑوں کی دعوت کی اور دعوت کے موقع پر بٹالہ کے ہوائی اڈے کی تباہی اور رنجیت سنگھ کی واپسی کا قصہ سنایا۔ جسے بچوں نے بہت دل چسپی سے سنا اور سب نے مل کر کہا "ہم بھی پائلٹ بنیں گے"۔

بلاعنوان

☆ اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 250 روپے کی کتابیں لیجئے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 7 اپریل

ماہ مارچ کے بلاعنون کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں سے جج صاحبان کو یہ تین عنوان: امی ذرا ٹھہرو ہمیں بھی چھپنا ہے۔ جلدی کرو' امّی نے دیکھ لیا تو شامت آ جائے گی اور فیملی سلائیڈ پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ عنوان تجویز کئے ان میں سے بذریعہ قرعہ اندازی یہ تین ساتھی انعام کے حق دار قرار پائے۔

- محمد حامد رانا' کامونکے (امّی ذرا ٹھہرو' ہمیں بھی چھپنا ہے۔ پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)
- محمد قاسم اویس' راول پنڈی (جلدی کرو' امّی نے دیکھ لیا تو شامت آ جائے گی۔ دوسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)
- کلیم اللہ خان' اسلام آباد (فیملی سلائیڈ۔ تیسرا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

Sharjeel Ahmed

ایک روشن مینار

ڈاکٹر رضوان ثاقب

بیٹی' آمنہ تپ دق جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ زندگی اور موت کی کش مکش سے دوچار تمنا کرتی ہے کہ کاش کوئی میرے پیارے ابو کو مجھ سے ملا دے۔ مگر باپ کو حکومت نے جیل میں بند کیا ہوا ہے اور ظلم کی انتہا یہ کہ باپ کو پیاری آمنہ کی صورت تک دیکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ باپ کی پریشانی بڑھتی ہے تو اس کی زبان سے اپنی لاڈلی کے لئے بے اختیار یہ دعائیہ اشعار نکلتے ہیں

میں ہوں مجبور پہ اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

امتحاں سخت سہی مگر دل مومن ہے وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

تیری صحت ہمیں مقصود ہے لیکن اس کو
گر نہیں منظور تو ہم کو بھی یہ منظور نہیں

باپ جیل میں بند' اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے بے تاب ہے۔ آمنہ بھی اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں میں اپنے شفیق باپ کا چہرہ ایک نظر دیکھنے کے لئے بے چین ہے مگر حکومت نے ملنے کی اجازت نہ دی۔ یہاں تک کہ اس کی بیٹی اسی بے چینی کے عالم میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔ باپ نے اپنی بیٹی کی جدائی کی خبر سن کر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر کہا "باری تعالیٰ مجھے اپنی رضا پر صابر و شاکر رہنے کی توفیق عطا فرما"۔

کراچی میں جب بغاوت کا مقدمہ چلا' سرکاری وکیل نے فرد جرم پڑھ کر سنائی تو اس مرد مجاہد نے کہا "میرا جرم اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ اس لیے کہ میں نے حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کر کے قانون الٰہی کی پیروی کی ہے"۔

جب اس روشن مینار کو ڈاون جیل سے منتقل کر کے چھندواڑے میں نظر بند کیا گیا تو ایمان و یقین کی یہ کیفیت تھی۔

تم یہ نہ سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
یہ غیب سے سامان بقا میرے لئے ہے
پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علیؓ کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے

توحید تو ہے کہ خدا حشر میں کہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

یہ ایسے اچھے شعر لکھنے والا شاعر' ادیب اور صحافی ہی نہیں بلکہ اونچے درجے کا مقرر بھی تھا۔ تقریر کرتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بندۂ خاکی کی آواز عرش اعلیٰ تک پہنچ رہی ہے۔ جلیاں والے باغ کا واقعہ ہوئے ابھی کچھ عرصہ ہی گذرا تھا جہاں جنرل ڈائر نے کئی ہزار آدمیوں کو گولی

چلوا کر ہلاک کر دیا تھا کہ 20 دسمبر 1919ء کو امرتسر میں مسلم لیگ کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ ہمت کا یہ پہاڑ ہردولی جیل سے رہا ہو کر جلسے میں شریک ہوا۔ ہزاروں مسلمانوں کا مجمع تھا۔ لوگوں میں انگریزوں کے خلاف بے انتہا نفرت کا جذبہ تھا۔ اس کی شرکت سے جلسے میں ایک عجیب ہنگامہ خیز کیفیت پیدا ہو گئی۔

1928ء کا واقعہ ہے لاہور میں ایک عظیم الشان سیاسی جلسہ منعقد ہوا۔ اسٹیج پر مولانا ابوالکلام آزاد' پنڈت جواہر لال نہرو' ڈاکٹر مختار احمد انصاری' مولانا ظفر علی خان اور حکیم اجمل خاں تشریف فرما تھے۔ لاکھوں کا مجمع تھا۔ مولانا ابوالکلام جیسے نام ور مقرر تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے' مجمع قابو میں نہیں آیا۔ مولانا ظفر علی خان جیسے شعلہ بیاں کھڑے ہوئے لیکن بات نہیں بنی۔ اب بقول میر انیس "ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے" تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوا تو مجمعے کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اسٹیج پر آتے ہی سر سے ٹوپی اتاری اور اسے اپنے دائیں ہاتھ میں لے کر اوپر اٹھایا اور گرج دار آواز میں کہا "اے انگریز قوم آج میں تجھ سے مخاطب ہوں تجھے یاد ہوگا کہ آج سے 300 سال پہلے تو نے ایک بادشاہ سے تاج مانگا تھا۔ اس نے تاج دینے سے انکار کیا۔ اس کے بدلے اسے اپنا سر دینا پڑا۔ آج میں تجھ سے تاج مانگتا ہوں۔ بتا تاج دے گی یا سر دے گی۔ اس جملے پر سارا پنڈال انقلاب زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ تقریباً" ایک گھنٹے تک یہ اللہ کا شیر دھاڑتا رہا او قصر سلطانی کی دیواریں ہل کر رہ گئیں۔ واپس آ کر اپنی نشست پر بیٹھا تو بغیر اعلان کے جلسہ خود بخود ختم ہو گیا اور لوگ اٹھ اٹھ کر اپنے گھروں کو چل دیئے۔

قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرتے ہوئے صحت جواب دے گئی۔ ادھر ہندوستان کی اعصاب شل کر دینے والی سیاست' ہندو اور انگریز کی شاطرانہ چالیں' مسلمانوں کو غلام بنا کر رکھنے کی سازش' ذیابیطس کا حملہ' ادھر گول میز کانفرنس کا تقاضا۔ دوستوں اور ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپ کی گرتی ہوئی صحت اس قدر لمبے اور تکلیف دہ سفر کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن جس کا دل ملک و ملت اور مذہب کی سچی لگن سے سرشار ہو اسے بھلا موت کا کیا ڈر۔

اسٹریچر پر ڈال کر جہاز میں بٹھایا گیا اور پھر برطانیہ میں گول میز کانفرنس میں اس مرد مجاہد نے وہ تقریر کی جس نے پوری دنیا میں تہلکا مچا دیا۔ یہ انگریزی زبان میں ایسی جامع اور مدلل تقریر تھی کہ مشہور انگریز ادیب ایچ جی ویلز نے لکھا "اس شخص کے سینے میں نپولین کا دل' برک کی زبان اور میکالے کا قلم ہے"۔

گول میز کانفرنس میں چوٹی کے انگریز اور ہندوستانی راہ نما شریک تھے۔ ریمزے میکڈانلڈ' جس نے ان کو جیل بھیجا تھا سامنے بیٹھا تھا۔ آپ نے فرمایا "کوئی ذی ہوش انسان جسے اتنی شدید بیماریاں ہوں سات میل سفر کرنے کا ارادہ بھی نہیں کر سکتا جب کہ میں سات ہزار میل کا بحری اور بری سفر طے کر کے یہاں پہنچا ہوں لیکن جب اسلام اور ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ سامنے ہو تو میں بے خود ہو جاتا ہوں۔ میرے یہاں آنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ میں اپنے ملک کے لئے آزادی کا پروانہ لے کر جاؤں۔ اگر جا سکا تو خوب ورنہ میں ایک غلام ملک میں جانے کے بجائے ایک آزاد ملک میں مرنا پسند کروں گا۔ آپ کو یا ہندوستان کو آزادی دینی ہوگی یا پھر مجھے دوگز زمین"۔ ریمزے میکڈانلڈ کو مخاطب کر کے کہا "سات کروڑ مسلمانوں کو اقلیت کہنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ نے مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے' پنجاب' سرحد' بلوچستان اور بنگال میں مسلمانوں کی آئینی حکومت قائم نہ کی تو یہ کوئی دھمکی نہیں بلکہ ایک مخلصانہ تنبیہ ہے کہ ہندوستان خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ جائے گا۔

اس تقریر میں موجود جرات' بے باکی' بے خوفی' استقامت او استقلال کو دیکھ کر یقیناً آپ عزم و ہمت کے

اس کو ہسار کا نام جاننا چاہتے ہوں گے۔ یہ مولانا محمد علی جوہرؒ کے علاوہ بھلا اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ اعزاز اور امتیاز اللہ تعالیٰ نے انہی کے مقدر میں لکھا تھا۔

مولانا محمد علی جوہرؒ ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم راہ نما تھے۔ 1878ء میں ریاست رام پور میں پیدا ہوئے۔ ابھی دو سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ بڑی مذہبی خاتون تھیں۔ اس لیے مولانا کو بچپن ہی سے اسلامی تعلیمات سے گہری دل چسپی ہو گئی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم رام پور اور بریلی میں حاصل کی پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ چلے گئے۔ بی اے کے امتحان میں الہ آباد یونی ورسٹی میں اول آئے۔ آکسفورڈ میں آئی سی ایس کرنے کے بعد واپس رام پور آئے اور ملازمت اختیار کر لی۔ مگر جلد ہی ملازمت سے دل بھر گیا پھر کلکتے جا کر انگریزی کا اخبار کامریڈ جاری کیا۔ کامریڈ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وائسرائے اپنی کاپی علیحدہ منگاتا اور لیڈی کے لئے علیحدہ کاپی آتی۔ وائسرائے ریٹائر ہو کر انگلستان چلا گیا تو کامریڈ وہاں بھی منگاتا تھا۔

انگریزی کے علاوہ مولانا کی اردو دانی بھی مسلم تھی۔ انہوں نے اردو روز نامہ ہمدرد بھی جاری کیا۔ جو بے باکی اور بے خوفی کے ساتھ اظہار خیال کا کام یاب نمونہ تھا۔ مولانا نے بے شمار غزلیں اور نظمیں لکھیں جو مجاہدانہ رنگ سے بھرپور ہیں۔ آپ کا یہ شعر آج بھی زبان زد عام ہے۔

قتل حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

آپ آل انڈیا مسلم لیگ کے بانی ممبروں میں سے ایک تھے۔ مسلم لیگ کی روداد اور مکمل کارروائی مولانا نے ہی ترتیب دی جس کا نام دی گرین بک ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی آپ ہی کی کوششوں سے قائم ہوا۔ جدوجہد آزادی میں سرگرم حصہ لینے کے "جرم" میں مولانا کی زندگی کا کافی حصہ قید و بند میں بسر ہوا۔ تحریک عدم تعاون میں کئی سال جیل میں رہے۔ 1919ء کی تحریک خلافت کے بانی بھی آپ ہی تھے۔ ترک موالات کی تحریک میں بھی گاندھی جی کے برابر کے شریک تھے۔ آپ جنوری 1931ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے انگلستان گئے۔ یہاں آپ نے وطن کی آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم (انگریز) میرے ملک کو آزاد نہ کرو گے تو میں واپس نہیں جاؤں گا اور تمہیں میری قبر بھی یہیں بنانا ہوگی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد 4 جنوری 1931ء کو آپ نے لندن ہی میں انتقال فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس لاڈلے کے لئے انبیاء کے پہلو میں جنت کا ایک ٹکڑا مخصوص کر رکھا تھا لہٰذا تدفین کے لئے آپؒ کے نعش بیت المقدس لے جائی گئی۔ یہاں مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی نے آپؒ کی نماز جنازہ پڑھائی۔

جاوید امتیازی

پکنک

نٹ کھٹ بھالو، نٹ کھٹ بھالو
آؤ بنائیں چاٹ کچالو

پِک نِک آؤ منائیں آج
جھیل کنارے جائیں آج
مانو، خالو، لالو، آؤ
پیارے نٹ کھٹ بھالو آؤ

نٹ کھٹ بھالو، نٹ کھٹ بھالو
آؤ بنائیں چاٹ کچالو

مانو باجی، مرچیں لاؤ
لالو بندر، برتن لاؤ
گیدڑ خالو، ڈھول بجاؤ
لومڑ چاچا، گیت سناؤ

نٹ کھٹ بھالو، نٹ کھٹ بھالو
آؤ بنائیں چاٹ کچالو

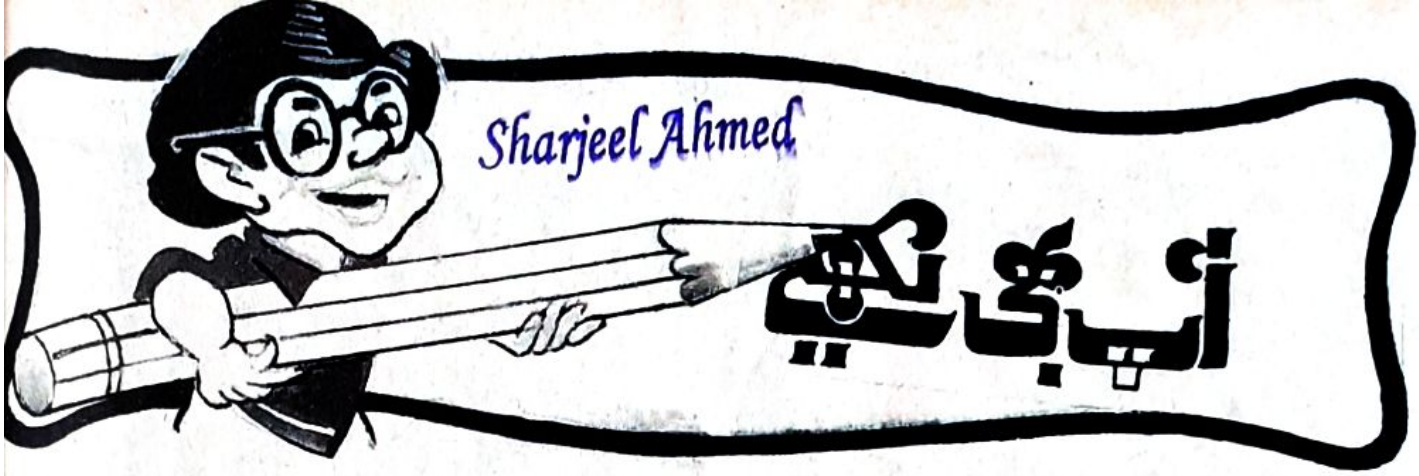

تبدیلی

عتیق الرحمان، لاہور

وقت کافی ہو چکا تھا اور بازار بند ہو چکے تھے۔ دور ایک جگہ روشنی جھلملاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ عمران اور اس کے دوست شہباز کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے تیز تیز روشنی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ قریب پہنچے تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہ ایک وڈیو سنٹر تھا۔ انہوں نے اپنی پسند کی وڈیو کیسٹ کا مطالبہ کیا پھر اس کے مل جانے پر بہت خوش ہوئے اور واپس گھر کی طرف چل پڑے۔

عمران اور شہباز بڑے گہرے دوست تھے۔ عمران پنڈی کے ایک کالج میں پڑھتا تھا۔ ایک سال بعد جب گھر آتا تو دونوں دوست ضرور کوئی فلم دیکھتے۔ گھر آ کر انہوں نے کیسٹ کو کور سے نکالا۔ مگر اب ان کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کیسٹ کے اوپر لکھا تھا "کربلائے کشمیر" دونوں دوست غصے میں بڑبڑائے "ہم نے مطالبہ تو انڈین فلم کا کیا تھا، یہ کیا نکل آیا؟ سارا مزا کرکرا ہو گیا ہے۔ اب کیا ہم یہ کشمیر کا کربلا دیکھیں گے"۔

"عمران یار، ایک مرتبہ لگا کر تو دیکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کوئی انڈین فلم ہی ہوگی۔ دکان دار سے غلطی سے اس پر "کربلائے کشمیر" کا اسٹکر لگ گیا ہوگا۔ عمران نے کیسٹ وی سی آر میں ڈالی۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ایک شخص جس کا نام غلام نبی ہے، اس کے پاس اس کا ایک بچہ اور ایک بچی بیٹھے ہوئے ہیں۔ بچے کا نام گل اور بچی کا نام صنوبر ہے۔

گل تھا تو چھوٹا لیکن تھا بڑا ذہین۔ وہ ہندوؤں کے اسکول میں پڑھتا تھا۔ اسکول کا نام "گورنمنٹ گاندھی پرائمری اسکول" تھا۔ ایک دن ٹیچر نے جو ہندو تھے، بچوں کو بتایا کہ کشمیر بھارت کا حصہ ہے اور اس پر پاکستان کا کوئی حق نہیں، اس بات پر گل سے نہ رہا گیا اور اس نے کھڑے ہو کر کہا "ماسٹر صاحب، آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ کشمیر کشمیریوں کا ہے اور کشمیری اس کو پاکستان کا حصہ بنانا چاہتے ہیں"۔

اس بات پر اس ہندو ٹیچر نے گل کو بہت مارا اور اس سے کہا کہ میں نے تمہارا نام اسکول سے خارج کر دیا ہے۔ گل روتا ہوا گھر آ گیا۔ اس کے ابو نے اسے تسلی دی اور کہا کہ ہمارے مسلم بھائی نے ایک اسکول کھولا ہے میں تمہیں اس میں داخل کرا دوں گا۔

جب پہلے دن گل نئے اسکول میں گیا تو اس نے ماسٹر صاحب سے سوال کیا "ہم آخر پاکستان ہی میں کیوں شامل ہونا چاہتے ہیں؟ ہمارا ان سے کیا رشتہ ہے؟"

ماسٹر صاحب نے کہا "بیٹا، سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ ہمارے مسلمان بھائی ہیں اور ہمارا اور ان کا رشتہ لا الہ الا اللہ کی بنیاد پر ہے۔ اس کے علاوہ جغرافیائی لحاظ سے کشمیر پاکستان کی شہ رگ بھی ہے اس لیے ہم اس کا پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں"۔

گل جب اسکول سے واپس گھر آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا بڑا بھائی جنگی تربیت کے لیے پاکستان جانا چاہتا ہے۔ دونوں بہن بھائی اپنے بڑے بھائی کو الوداع کر کے گھر پہنچے ہی تھے کہ ایک پنڈت، رام ترشو آ گیا۔ یہ دراصل بھارتی فوج کا مخبر تھا۔ اس نے فوراً بھارتی فوج کو خبر کر دی کہ مسلموں کے گھر کا ایک

جوان تربیت کے لیے پاکستان روانہ ہو گیا ہے۔

فوج کے میجر' شرما نے غلام نبی کے گھر پر چھاپہ مارا اور اس کو اور اس کے دونوں بچوں کو گرفتار کر لیا۔ بچوں کو میجر نے اذیت خانے میں بھیج دیا اور غلام نبی کو بیڑیاں پہنا کر جیل میں بند کر دیا۔ 15 دن بعد میجر شرما نے غلام نبی کو جیل سے باہر نکالا اور اس سے پوچھا "بتاؤ اگر وادیوں (مجاہدوں) کے ٹھکانے کہاں کہاں ہیں"۔ اس پر غلام نبی نے کہا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میجر نے کہا اچھا پھر پکارو اپنے اللہ کو اور مجھے توڑ کر دکھاؤ یہ بیڑیاں لیکن یہ کیا؟ غلام نبی نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور بیڑیاں کو اس قدر زور سے کھینچا کہ وہ ایک طرف سے ٹوٹ گئیں۔ یہ دیکھ کر سب سپاہی ڈر گئے۔ غلام نبی نے سپاہیوں کو زنجیروں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر میجر نے گولی چلا دی۔ غلام نبی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ میجر شرما نے غلام نبی کے بچوں سے کہا کہ اب میں تمہارا بھی یہی انجام کروں گا۔ مگر گل نے کہا "ٹھہرو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مجاہدوں کے ٹھکانے کہاں ہیں"۔

میجر نے کہا "جلدی بتاؤ"

گل نے کہا "اپنا کان میرے منہ کے پاس لاؤ تاکہ کوئی دوسرا نہ سن لے"۔

جیسے ہی میجر نے اپنا کان گل کے منہ کے قریب کیا تو گل نے اس قدر زور سے میجر کے کان پہ کاٹا کہ میجر پاگلوں کی طرح چلا اٹھا۔ اب میجر گل کو گولیوں سے اڑانے ہی والا تھا کہ اس کی بہن صنوبر بول اٹھی "ٹھہرو میں بتاتی ہوں"۔

میجر نے کہا "جلدی بتاؤ"۔

صنوبر نے بھی یہی کہا کہ کان قریب لاؤ۔ میجر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے صنوبر کے قریب ہوا تو صنوبر نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے گالوں پر زبردست تھپڑ رسید کیے۔ میجر شرما پاگل کتے کی طرح چلا اٹھا "اب میں تم دونوں کو نہیں چھوڑوں گا"۔ اور پھر میجر نے بڑی بے دردی سے گل کی آنکھیں نکال دیں اور صنوبر کی زبان کاٹ ڈالی۔

اس دردناک منظر کو دیکھ کر عمران اور شہباز ایک مرتبہ پھر بے اختیار رو پڑے۔

دونوں بہن بھائیوں کو میجر شرما نے رام ترشو کے ساتھ گھر بھیج دیا۔ پنڈت ترشو نے ان کے گھر پہنچ کر ایک زوردار قہقہ لگایا اور کہا کہ اب تو یہ سارا گھر میرا ہو گیا اور مختلف صندوقوں کی تلاشی لینے لگا۔

چوں کہ صنوبر کی آنکھیں سلامت تھیں اس لیے پنڈت نے اس سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اتنی دیر میں گل کے چچا وہاں آ گئے۔ انہوں نے جب اپنی بھتیجی صنوبر کو مردہ پایا تو وہ غم کے مارے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔

لہٰذا انہوں نے وہاں پر موجود پنڈت کو پکڑ لیا اور بالکل پاگلوں کی طرح اس کا گلا اس قدر زور سے دبایا کہ پنڈت وہیں پر رام رام کرتے مر گیا۔ انہوں نے پنڈت کی لاش کو کندھے پر اٹھایا اور باہر نکل گئے۔

گل کے کچھ رشتے دار اس کے گھر آئے۔ وہ گل کی آنکھیں کھو جانے اور صنوبر کی موت پر دکھ کا اظہار کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں میجر شرما اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ ان کے گھر میں داخل ہوا اور بندوق تان کر کہنے لگا "پکارو اپنے پاکستانیوں کو' ان کا مدد کے لئے آنا تو درکنار وہ تمہاری آواز بھی نہیں سنیں گے۔ وہ تو اپنے جشن منانے میں مصروف ہیں۔ انہیں تم سے کیا غرض؟" اتنی دیر میں گل کے پاگل چچا جو پنڈت کی لاش پھینکنے گئے تھے' آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی میجر شرما کو پیچھے سے دھکا دیا۔ میجر شرما گر پڑا۔ موقع پاتے ہی گل کے عزیزوں نے اپنی بندوقیں سنبھال لیں پھر انہوں نے اس کے ساتھی سپاہیوں کو اور میجر کو فائر کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ فلم کے آخر میں نابینا گل پاکستانیوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

"اے پاکستانی بھائیو' تم کب ہوش میں آؤ گے؟ جب میرے جیسے کشمیر کے سب معصوم اپنی آنکھیں کھو بیٹھیں گے؟ جب میری سب معصوم بہنیں اپنی جان اور عزت کھو بیٹھیں گی؟ جب میرے سب باپ بے گناہ مار ڈالے جائیں گے؟ خدارا ہوش میں آؤ۔ یہی وقت ہے ہوش میں آنے کا"۔

عمران اور شہباز فلم دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ عمران نے

شہباز سے کہا "یار میں تو آیندہ نہ ہی بھارتی فلمیں دیکھوں گا اور نہ گانے سنوں گا۔ اور اپنا جیب خرچ کشمیر فنڈ میں جمع کرایا کروں گا"۔

شہباز کچھ نہ بولا اور خاموشی سے اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ عمران اسی روز صبح سویرے اپنے کالج' راول پنڈی چلا گیا۔ ایک سال بعد جب وہ گھر واپس آیا تو اس نے سوچا کیوں نہ آج شہباز کو بلاؤں تاکہ دونوں مل کر کوئی فلم دیکھ سکیں۔ جب اس نے شہباز کے گھر فون کیا تو اس کی والدہ نے علیک سلیک کے بعد بتایا کہ شہباز تو اسی روز جب تمہارے گھر سے واپس آیا تھا کشمیر چلا گیا تھا۔ عمران یہ سن کر اس قدر حیران ہوا کہ اس کی زبان سے مزید ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ اس نے فون کا ریسیور نیچے رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ شہباز کیسے کر بلائے کشمیر سے کشمیر تک جا پہنچا

(پہلا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

زمانے کو سمجھاؤ کہ...

جعفر حبیب کھوکھر' راجن پور

ویگن منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ مسافر آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ اچانک جیسے بھونچال آ گیا۔ بریک چرچرائے مسافر سکون میں آئے تو آگے کا منظر واضح ہو گیا۔ سیاہ رنگ کی موٹر سائیکل آگے جا رہی تھی۔ ایکسی ڈنٹ ہوتے ہوتے بچا تھا۔ سانس بحال ہوئے تو سب یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے کہ یہ ہوا کیسے؟ آخر ایک مسافر نے ڈرائیور سے پوچھ ہی لیا اور ڈرائیور بتانے لگا کہ کس طرح اچانک ایک تیز رفتار بائیک سامنے آئی اور کتنی مشکل سے اس کو ویگن کنٹرول کرنا پڑی۔

لوگ پھر باتوں میں کھو گئے۔ کوئی 5 منٹ بعد تیز رفتار ویگن نے ادھر ادھر کٹ لگائے۔ باتوں والے باتیں چھوڑ کر آگے دیکھنے لگے۔ وہی سیاہ رنگ کی موٹر سائیکل غلط اوور ٹیک کر رہی تھی۔ ویگن کا ڈرائیور آہستہ آہستہ بریک لگا رہا تھا۔ یک دم بریک لگانے سے بہت بڑا نقصان ہو سکتا تھا کیوں کہ بہت سی کاریں اور ویگنیں اس کے پیچھے آ رہی تھیں۔ موٹر سائیکل والے اپنی رفتار کم نہ کر رہے تھے۔ وہ ویگن کو اوور ٹیک کرنے کے چکر میں تھے۔ سامنے سے ایک ٹرک آ رہا تھا۔ انہوں نے تب بھی موٹر سائیکل کی رفتار کم نہ کی۔ ویگن کے ڈرائیور کو اپنی رفتار بہت مشکل سے بہت حد تک کم کرنا پڑی۔ موٹر سائیکل ایک دم سے ڈرائیور سائیڈ کے برابر آ گئی اور ادھر دوسری طرف سے تیز رفتار ٹرک برابر میں آ گیا۔ موٹر سائیکل کا اگلا پہیا تو تیز رفتاری میں آگے نکل گیا لیکن پچھلا پہیا ویگن سے ٹکرا گیا اور تیز رفتار موٹر سائیکل لڑکھڑاتی ہوئی سڑک کے نیچے کچی زمین پر جا گری۔ دونوں سوار بھی ہوا میں اچھلتے ہوئے ایک دوسرے سے دور جا گرے۔ دیکھنے والوں نے آنکھیں بند کر لیں کیوں کہ ان دونوں کی موت یقینی تھی اور اگر مرنے سے بچ بھی گئے تو دو تین ہڈیاں ٹوٹنے کا سو فی صد یقین تھا۔

ڈرائیور نے ویگن روکی تو مسافر نیچے اترے۔ دوسری ٹریفک بھی رک گئی۔ ہر کوئی موٹر سائیکل والوں کو قصوروار ٹھہرا رہا تھا کیوں کہ انہی کی غلطی کی وجہ سے یہ حادثہ ہوا تھا۔ خدا کا کرم ایسا ہوا کہ موٹر سائیکل پہ سوار دونوں جوانوں کو کوئی خاص چوٹ نہ آئی۔ بس معمولی سی چوٹیں تھیں۔ وہ دونوں کراہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ٹوٹی ہوئی موٹر سائیکل ایک طرف پڑی تھی۔ لوگ ان دونوں جوانوں کو نصیحتیں کر رہے تھے۔ دونوں نوجوان غصے سے ڈرائیور کی طرف بڑھے۔ ایک نے گریبان پکڑ لیا۔ دوسرے نے ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ کنڈکٹر اور دوسرے مسافر آگے بڑھے اور دونوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ساری آوازیں ڈرائیور کے حق میں بلند ہو رہی تھیں۔ اتنے میں ایک زوردار آواز ابھری "ڈی ایس پی اپنے دو محافظوں کے ساتھ ادھر آ رہا ہے"۔

"کیا بات ہے؟ یہ جھگڑا کیوں ہو رہا ہے؟" ڈی ایس پی نے آتے ہی پوچھا۔ تب ڈرائیور آگے بڑھا اور سارا حال بتانے لگا۔ سب لوگوں نے ڈرائیور کی تائید کی اور اس کے حق میں آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

"اچھا وہ دونوں نوجوان کہاں ہیں؟" ڈی ایس پی نے پوچھا

تو لوگوں نے بتایا کہ وہ ادھر ہیں۔ انہیں چار پانچ لوگوں نے پکڑ رکھا ہے کیوں کہ وہ ڈرائیور سے لڑنا چاہتے ہیں۔

"انہیں ادھر لے آؤ" ڈی ایس پی نے حکم دیا تو دونوں نوجوان سامنے لائے گئے۔

"ابو" ان میں سے ایک ڈی ایس پی کی طرف بڑھا۔ مجمعے کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

"ابو اس نے جان بوجھ کر ٹکر ماری ہے۔ اسے مت چھوڑنا" نوجوان غصے سے ڈرائیور کی طرف بڑھا مگر اس کے ابو (ڈی ایس پی) نے روک لیا۔ وہ آوازیں جو پہلے ڈرائیور کے حق میں بلند ہو رہی تھیں آہستہ آہستہ مدہم ہوتی گئیں اور ان کی جگہ نئی آوازوں نے لے لی۔

"اس ڈرائیور کو گرفتار کرلیں سر" ایک نے کہا۔

"یہ تیز رفتاری کو شوق سمجھتا ہے سر" ایک اور آواز بلند ہوئی۔

"اگر یہ ایسے ہی ڈرائیونگ کرتا رہا تو کئی آدمیوں کی جان لے لے گا" مجمعے میں سے ایک باریش شخص بولا۔

"کئی بچوں کو یتیم اور کئی ماؤں کو بیوہ' کئی بہنوں کو بھائی کے پیار سے محروم کردے گا یہ سر" ایک نوجوان نے کہا جو اچھا خاصا تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔

"سر' اسے فوراً گرفتار کرلیں" ایک اور شخص بولا۔

واقعہ کے عینی شاہد موجود تھے۔ ہر کوئی ڈرائیور کی گرفتاری کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اور ہوا بھی ایسے ہی۔ ڈی ایس پی کا اشارہ پاتے ہی چند سپاہی آگے بڑھے اور ڈرائیور کو پولیس کی گاڑی میں بٹھالیا۔ وہ بے بس آنکھوں سے لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی زبان پر ایک ہی ورد جاری تھا کہ زمانے کو سمجھاؤ کہ حق کا ساتھ دے۔ مگر اب کسی کی بھی ڈرائیور کے حق میں آواز بلند نہ ہوئی (دوسرا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

احساس

محمد شفیق شجاعت' حجرہ شاہ مقیم

میں اسکول سے تھکا ماندہ گھر لوٹا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اچانک اچھلتی کودتی دو چڑیاں آکر منہ پر لگیں۔ کتاب ہاتھ سے نکل کر فرش پر جا پڑی۔ جسم ہلکا سا کپکپا کر رہ گیا۔ "ان چڑیوں نے کتنا تنگ کر رکھا ہے" زبان سے بے اختیار نکلا "رات دن چوں چوں لگائے رکھتی ہیں۔ کتنا ڈسٹرب کرتی ہیں یہ' سورج طلوع ہونے سے پہلے جب میٹھی نیند میں ہوتا ہوں اپنی چوں چوں سے نیند خراب کردیتی ہیں"۔

دل میں کئی مرتبہ آیا کہ ان کا گھونسلا جو میرے کمرے کی چھت میں بنا ہوا ہے اکھاڑ پھینکوں لیکن میں ایسا نہ کرسکا۔ اس روز خدا جانے میں کس موڈ میں تھا کہ اچانک چڑیوں کا آکر منہ پر لگنا' ہاتھ سے کتاب کا گرنا اور جسم ہلکا سا کپکپا کے رہ جانا برداشت نہ کرسکا۔ ایک لمبا سا ڈنڈا اٹھایا اور شہتیر کی دو اینٹوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے تنکوں سے بنے ہوئے گھونسلے کو گرا دیا۔ جب گھونسلے کی جگہ کوئی تنکا نہ بچا تب ڈنڈے کو ایک جانب پھینک کر چارپائی پر گر گیا۔ جب کچھ سکون آیا تو سوچنے لگا "اب یہ بے چارے چھوٹے چھوٹے پرندے کہاں جائیں گے" ایک طرف ہمدردی کا جذبہ تھا دوسری طرف دل کو یہ بات پسند بھی تھی کہ چلو اچھا ہوا روزانہ ڈسٹرب ہونا پڑتا تھا۔ ذہن کو مکمل سکون ملنے تک یونہی چارپائی پر لیٹا رہا۔ پھر قریب رکھی تاریخ کی کتاب اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ ایک صفحہ پر آکر نظریں ٹھہر گئیں۔ لکھا تھا:

"سوار کا گھوڑا تھک چکا تھا۔ اس کی پیشانی سے تھکاوٹ کے آثار صاف ظاہر ہو رہے تھے لیکن وہ پھر بھی نہ رکا۔ وہ ایک قاصد تھا۔ لشکر تک اگر دو دنوں میں نہ پہنچتا تو اس کے ساتھیوں کو ایک بہت بڑا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ اس کے گھوڑے کے چلنے ہی سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کئی روز سے پانی اور خوراک سے محروم رہا ہے۔ سوار خود بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔ وہ انجانے سے جذبہ کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ فاصلہ کم ہوتا رہا۔ وہ ایک لشکر کا معمولی سپاہی تھا۔ جس لشکر کا سپہ سالار عمرو بن العاص مختلف علاقوں کو فتح کرتا' ظلم و ناانصافی اور اونچ نیچ کے رسم و رواج کو اپنے پاؤں تلے روندتا' خدا کی زمین پر سبز پرچم لہراتا آگے بڑھ رہا تھا۔

بڑھتے بڑھتے وہ ایک ریگستانی علاقے میں آنکلا تھا۔ سپاہی

لشکر کے سپہ سالار تک کوئی خاص پیغام پہنچانے کے لیے گھوڑے کو دوڑاتا رہا۔ جب سورج کی روشنی اپنے جوبن پر پہنچی تو اس نے سامنے میدان میں ایک خیمہ دیکھا۔ امید بھرے جذبے کے ساتھ وہ خیمہ کی سمت چلا۔ جب وہاں پہنچا تو اس نے لشکر کے اکیلے سپاہی کو خیمے میں دیکھا۔ اس سپاہی سے لشکر کے متعلق پوچھا۔

"لشکر یہاں سے زیادہ سے زیادہ ایک روز کے فاصلے پر ہے۔ آج رات آپ یہاں رہیں خود بھی کچھ آرام کریں اور گھوڑے کو بھی آرام لینے دیں۔ صبح تازہ دم ہو کر لشکر تک جا پہنچنا" خیمے میں موجود سپاہی نے قاصد سے کہا۔

قاصد کو یہ بات پسند آئی۔ اس نے وہ رات وہیں گزارنے کا ارادہ کیا۔ اچانک اس کی سوچ میں تبدیلی آئی جیسے کچھ یاد آگیا ہو' کہنے لگا "میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں کہ آپ یہاں اکیلے خیمے میں کیا کر رہے ہیں۔ ہر طرف ریت ہی ریت ہے۔ نہ کوئی درخت ہے نہ قریب پانی"۔

سپاہی سوار کے اس سوال پر معمولی سا مسکرایا اور بولا "ہمارا لشکر ایک ہفتہ پہلے یہاں ایک ماہ تک ٹھہرا تھا۔ یہ خیمہ لشکر کے سپہ سالار عمرو بن العاص کا تھا۔ خیمے میں کسی چڑیا نے گھونسلا بنا لیا۔ جب ہمارے کوچ کرنے کا وقت آیا تو چڑیا کے گھونسلے میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ اگر اس خیمے کو اکھاڑا جاتا تو اس بیابان میں چڑیا اپنے بچوں کو لے کر کہاں جاتی جو کہ ابھی اڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ہمارے سپہ سالار نے مجھے ان پرندوں کی دیکھ بھال کے لیے یہاں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ جب تک ان پرندوں کے بچے بڑے ہو کر اڑ نہیں جاتے تب تک یہاں رہوں' میں ان کا خیال رکھوں اور ان کو پانی اور خوراک فراہم کرتا رہوں"۔

شام کے اندھیرے نے اپنے پر پھیلانے شروع کیے تو میں نے کتاب بند کرتے ہوئے دیکھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے پرندے جن کا سارا گھر فرش پر بکھرا ہوا تھا' واپس آئے۔ چیختے' اڑتے اپنے گھر کو برباد دیکھ کر چاروں طرف چکر لگانے لگے۔ میرے دل میں ایک احساس پیدا ہوا۔ میں شرمندگی اور احساس ندامت سے اٹھا۔ وہی تنکے فرش سے سمیٹ کر چارپائی پر کھڑا ہو کر اسی جگہ

رکھنے کی کوشش کرنے لگا (تیسرا انعام: 40 روپے کی کتابیں)

آئینہ

رحمان خان' لاہور

موٹر سائیکل تیز رفتاری سے دوڑاتا ہوا ضیا جیسے ہی گھر پہنچا تو اس کی نگاہ ڈرائنگ روم پر پڑی جہاں اس کے والد اس کا انتظار کر رہے تھے۔ رات کے 11 بج چکے تھے مگر نجانے ضیا کن سرگرمیوں میں مصروف تھا کہ اسے وقت گزرنے کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔

جب وہ اندر پہنچا تو ڈرائنگ روم میں بیٹھے اپنے والد کو نظر انداز کرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ شاید وہ بہت تھکا ہوا تھا یا پھر اپنے والد کے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔

"ضیا بیٹے" اس کے والد کی آواز نے اس کے اٹھتے قدم روک دیئے۔

"جی ابو" وہ اپنے ابو کی طرف مڑا۔

"بیٹا ادھر آؤ' میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں" ضیا کے ابو نہایت نرم آواز میں بولے۔

ضیا بلا چوں چراں اپنے والد کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"بیٹا کدھر تھے" اس کے ابو نے پوچھا۔

"ابو' میرے ایک دوست کی سال گرہ تھی۔ ادھر گیا تھا" ضیا سر جھکا کر بولا۔

"لیکن بیٹا آپ نے یہ نہیں سوچا کہ گھر سے اتنی دیر غائب رہنا اچھی بات نہیں"۔

"سوچا تھا ابو' مگر مزا ہی بہت آرہا تھا"۔

"بیٹا' مجھے آپ کے متعلق بہت سی شکایتیں ملتی رہتی ہیں' آپ کالج میں غریب طلبہ کو تنگ کرتے ہیں۔ گھر کے ملازمین کے ساتھ بھی آپ کا رویہ اچھا نہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟" ضیا کے ابو نے کہا۔

"ابو غریب لوگ ہوتے ہی اس قابل ہیں۔ ان کے ساتھ جتنا برا سلوک کیا جائے کم ہے" ضیا نفرت بھرے لہجے میں بولا۔

1997 - 1947

"کیوں بیٹا' کیا غریب لوگ انسان نہیں ہوتے؟"

"ہوتے ہیں لیکن نفرت کے قابل"۔

یہ سن کر اس کے ابو چند لمحے خاموش رہے پھر بولے " بیٹا' وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ اگر کبھی ہم اس مرتبے پر نہ رہے جس پر اب ہیں تو پھر"۔

یہ سن کر ضیا نے سر جھکا لیا۔ شاید اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ یہ دیکھ کر وہ مسکرائے پھر کہنے لگے "بیٹا' میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ شاید یہ کہانی سن کر تمہارے ذہن میں دولت کا گھمنڈ ختم ہو جائے۔ تقریباً" 27 سال پہلے اس شہر میں ایک غریب تاجی رہا کرتا تھا۔ سارا دن محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا۔ مالی مشکلات کی وجہ سے وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اس کا ایک دوست قیوم جو اس کے گھر کے قریب ہی رہتا تھا ایک بچے کا باپ تھا۔ اس بچے کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا اور قیوم ہی اس بچے کو پالتا تھا۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ پھر ایک دن قیوم ایک حادثے میں مارا گیا اور اس کا بچہ بالکل بے سہارا ہو گیا۔ ایسے میں اس کے دوست تاجی نے قیوم کے بیٹے کو گود لے لیا اور اس بچے کو اپنے دوست کی نشانی سمجھ کر پالنے لگا۔ اب بھلا تمہیں معلوم ہے کہ تاجی کہاں ہے؟" یہاں تک کہہ کر ضیا کے ابو نے ضیا کی طرف دیکھا۔

"مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟" ضیا نے جواب دیا۔

وہ تاجی اس شہر کا رئیس تاج دار احمد ہے" ضیا کے ابو نے کہا۔

یہ سن کر ضیا کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور اسے کمرا گھومتا ہوا محسوس ہوا کیوں کہ تاج دار احمد تو ضیا کے ابو ہی کا نام تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس کے والد نہیں۔ ضیا کو کش مکش میں دیکھ کر تاج دار احمد نے کہا "یہی سچائی ہے اور میں نے تمہیں اس لیے بتائی کہ تم برائی سے بچو۔ یہ سب کچھ خدا کی دین ہے۔ شاید یہ میری اس نیکی کا ہی صلہ ہے۔ میں نے کبھی تمہیں یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ تم میرے بیٹے نہیں لیکن اس لیے بتانا پڑا کہ تم دولت کے تکبر میں تھے"۔

چند لمحوں تک ضیا خاموش رہا پھر کہنے لگا "میں وعدہ کرتا ہوں آج کے بعد کسی کو کبھی اپنے سے کم تر نہیں سمجھوں گا"۔

یہ سن کر تاج دار احمد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور انہوں نے ضیا کو سینے سے لگا لیا (چوتھا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

موت کے منہ میں

صہیب محمود' لاہور

کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو ذہن سے مٹائے نہیں مٹتے۔ ایسا ہی ایک واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ یہ پچھلی گرمیوں کی بات ہے۔ ہمارے تایا جان نے ہمیں چھٹیاں گزارنے کے لیے باڑا گلی آنے کی دعوت دی۔ باڑا گلی نتھیا گلی سے کچھ ہی اوپر واقع ہے۔ ہمارے تایا جان نے جہاں رہنے کا انتظام کیا تھا وہاں قریب ہی ایک جنگل تھا جس میں کئی خطرناک درندے رہتے تھے۔ ہمارے بڑوں نے ہمیں اس طرف جانے سے سختی سے منع کیا تھا۔

ایک دن ہم سب کزنز نے مل کر کھیلنے کا پروگرام بنایا۔ جس جگہ میں چھپا تھا مجھے یقین تھا کہ کوئی مجھے نہیں ڈھونڈ سکے گا۔ اسی لمحے کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میں اچھل پڑا۔ جیسے ہی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ میرے پیچھے ایک بہت بڑا کالے رنگ کا ریچھ کھڑا تھا۔ میں نے یہ سن رکھا تھا کہ اگر لوگ زیادہ ہوں تو ریچھ قریب نہیں آتے۔ ہمیشہ اکیلے آدمی پر حملہ کرتے ہیں۔

میں نے ایک زوردار چیخ ماری اور اس طرف بھاگ اٹھا جدھر میرے باقی کزنز تھے۔ اس وقت اگر میں ریس میں حصہ لیتا تو یقیناً پہلا انعام جیتتا۔ لیکن یہ میری زندگی کا سوال تھا۔ سب لوگ میری چیخ کی آواز سن کر میری طرف بھاگے۔ جب ریچھ نے اتنے سارے لوگوں کو دیکھا تو جنگل میں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد چار دن تک میرا بخار نہیں اترا اور میں یہ سوچ کر آج بھی حیران ہوتا ہوں کہ کیسے اللہ میاں نے مجھے موت کے منہ سے بچا لیا (پانچواں انعام: 30 روپے کی کتابیں)

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
R.L.NO.4756 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00

سوال پوچھیے

آئزک آئیموف نے بچوں میں سائنسی تعلیم کے فروغ کے لئے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ یہ سب کتابیں ان کی لکھی ہوئی ہیں۔ آپ کو ان تمام سوالوں کے جواب ان کتابوں میں ملیں گے۔ جنہیں جان کر آپ کو مزا بھی آئے گا اور حیرت بھی ہو گی!!

فیروزسنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی